جون ۹۳
MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

اخلاق کے ذریعہ دل کو جیتا جا سکتا ہے
اور دل کو جیتنے کے بعد کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی
جس کو جیتنے کی ضرورت ہو

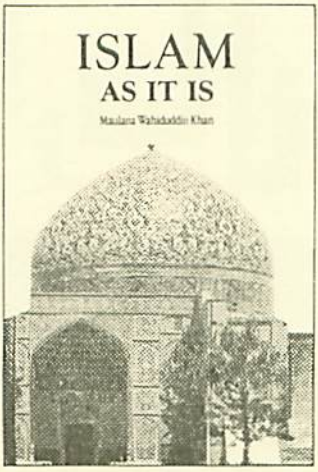

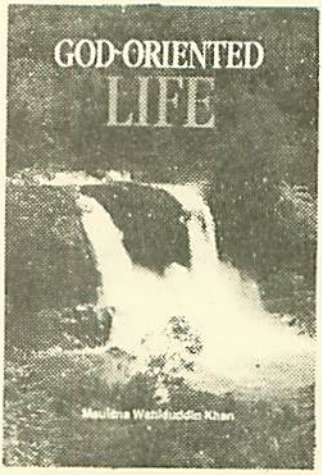

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is*, Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۳ ، شمارہ ۱۹۹

نماز ذریعہ علاج	۴	امن کمیٹی	۱۲
کلمۂ حکمت	۵	فرق کو جانئے	۱۳
قرآن میں تفکر	۶	ہندو مسلم ڈائیلاگ	۱۴
شکر خداوندی	۷	نئے عہد کے دروازہ پر	۱۸
روح دین	۸	جج اپیرٹ	۲۶
زمانہ کا فرق	۹	غلطی کی تصحیح	۲۸
انسان کی تبدیلی	۱۰	ایک سفر	۲۹
سب سے بڑی ناقدری	۱۱	خبرنامہ اسلامی مرکز ۸۹	۴۷

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel4697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn : Al-Risala)
Single Copy Rs 6: Annual Subscription Rs 70/$25 (Air-mail)

نماز ذریعۂ علاج

كانَ فتىً من الانصار يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم ولا يدع شيئا من الفواحش والسرقة الا ركبه۔ فذُكر للنبي صلى الله عليه وسلم فقال: ان الصلاة ستنهاه۔ فلم يلبث ان تاب وصلحت حاله۔ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الم اقل لكم

(الجامع لاحكام القرآن ۱۳/۴۸-۳۴۷)

انصار کا ایک نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ فواحش اور سرقہ کا بھی ارتکاب کرتا تھا۔ اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز عنقریب اس کو ان چیزوں سے روک دے گی۔ آخر کار اس نے توبہ کر لی اور اس کا حال درست ہو گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔

نماز اگر واقعی شعور کے ساتھ پڑھی جائے تو وہ آدمی کے اندر حساسیت کو جگانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب آدمی کے اندر دینی حساسیت جاگ اٹھتی ہے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ اصلاح کے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد نماز اس کے لیے صرف ایک روایتی عمل نہیں رہتی، بلکہ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: (ان الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر (نماز آدمی کو فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے)

مذکورہ نوجوان پہلے بے شعوری کی نماز پڑھتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن بدلا۔ وہ چونکہ عربی جانتا تھا، اس لیے قرآن کی قرأت اور نماز کی دوسری دعائیں اور اذکار اس کے ذہن پر اثر ڈالتے رہے۔ مسجد میں اہل ایمان سے ملاقات اور گفتگو اس کو نئی سوچ کی طرف بڑھاتی رہی۔ اس طرح کی مختلف چیزیں مسلسل اس کے اوپر اثر انداز ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ بے روح نمازی سے اوپر اٹھ کر وہ سچا نمازی بن گیا۔

ہر شکل کے ساتھ ایک اسپرٹ ہوتی ہے۔ کوئی آدمی اگر شکل کو پوری طرح اختیار کر لے تو اسپرٹ بھی دھیرے دھیرے اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔

کلمۂ حکمت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتاتی ہیں
پ کو جب بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت کا اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت
نتخاب فرماتے تھے (ما خیّر بین امرین إلا اختار ایسرھما)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دانش مند وہ نہیں جو خیر اور شر کے فرق کو جانے۔
دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کون سا خیر ہے (لیس العاقل الذی یعرف
خیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیۃ للعقاد، صفحہ ۵۰۵

اسی بات کو امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ دانش مند وہ نہیں ہے جس کو خیر اور شر کے درمیان
نتخاب کرنا ہو اور وہ ایک چیز کا انتخاب کر لے۔ دانش مند تو وہ ہے جو دو شر کے درمیان
جائے اور پھر دونوں میں سے جو آسان ہے اس کا انتخاب کرے (لیس العاقل
لذی یقع بین الشر والخیر فیختار۔ إنما العاقل الذی یقع بین الشرین
ختار ایسرھما) الامام الشافعی، تالیف عبد الحلیم الجندی، القاہرہ، صفحہ ۴۹

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ شہر میں غیر مسلموں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ مسلم
الف نعرہ لگاتا ہوا مسلمانوں کے محلہ سے گزرتا ہے جو مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر دینے والا
ہے۔ یہ بظاہر شر کی ایک صورت حال ہے۔ لیکن بار بار کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمان اگر اس شر کو
انے کے لیے اٹھیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ جلوس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے بجائے عملاً جو چیز پیش
ہے وہ یہ کہ جلوس کا معاملہ بڑھ کر فساد کا معاملہ بن جاتا ہے۔

گویا اس مسئلہ میں مسلمانوں کے لیے واقعی انتخاب جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے۔
جلوس اور فساد میں ہے۔ اب مذکورہ اسلامی اصول کے مطابق، عقل مند وہ ہے جو جلوس کو
ارہ کر لے تاکہ وہ ہلاکت خیز فساد سے بچ جائے۔

موجودہ دنیا میں تمام معاملات کا حال یہی ہے۔ یہاں اکثر اوقات کم شر اور زیادہ شر کے
میان انتخاب کا مسئلہ رہتا ہے نہ کہ خالص شر اور خالص خیر کے درمیان۔

قرآن میں تفکر

قرآن میں کہا گیا ہے کہ ـــــ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات ا
دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور ا
کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ وہ
اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ
کے عذاب سے بچا (آل عمران ۱۹۱ - ۱۹۰)

تمام بہترین باتیں آدمی کو غور وفکر کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایک عرب شاعر نے نہایت
صحیح کہا کہ جب آدمی کے اندر فکر اور سوچ کی کیفیت ہوتی ہے تو ہر چیز سے اس کو نصیحت حاص
ہوتی ہے :

اذا المرء کانت لہ فکرۃ ففی کل شیٔ لہ عبرۃ

اس آیت کے سلسلہ میں مختلف حدیثیں منقول ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک روایت کے
مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ ان آیتوں کو پڑھیں ان کو چاہیے کہ وہ ا
پر غور کریں (فلیتفکروا فیھا) آپ نے فرمایا کہ اس شخص کی خرابی ہے جس نے ان آیتو
کو پڑھا مگر اس پر غور نہیں کیا (ویل لمن قرأ ھذہ الآیات ثم لم یتفکر فیھا) ۱/۴۴۱

امام الاوزاعی سے پوچھا گیا کہ ان آیات میں تفکر سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے جواب
کہ آدمی ان کو پڑھے اور وہ ان کو سمجھے (قیل للاوزاعی ما غایۃ التفکر فیھ
قال : یقرؤھن وھو یعقلھن) ۱/۴۴۱

عامر بن عبد قیس کہتے ہیں کہ میں نے ایک سے زیادہ اصحاب رسول کو یہ کہتے ہوئے
کہ ایمان کی روشنی غور وفکر ہے (ان ضیاء الایمان التفکر) حضرت عمر بن عبدالعز
نے کہا کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرنا سب سے اعلیٰ عبادت ہے (الفکرۃ فی نعم اللہ
افضل العبادۃ) بشر بن الحارث الحافی نے کہا کہ اگر لوگ اللہ کی عظمت میں غور کریں تو وہ
گناہ نہ کریں (لو تفکر الناس فی عظمۃ اللہ تعالیٰ لما عصوہ)

شکرِ خداوندی

انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کا شکر کرنے والا بنے۔ شکر گزاری پورے دین کا خلاصہ ہے۔ ن میں بار بار مختلف انداز میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حتی کہ شکر کو سب سے بڑی حکمت بتایا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے (لقمان ۱۲)

انسان کے پاس جو کچھ ہے، سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ انسان کا جسم، اس کی ذہنی صلاحیتیں، دگی کے تمام مواقع، ہر قسم کے وسائل و ذرائع سے بھری ہوئی دنیا، شمسی نظام اور ساری کائنات، ن ذرہ سے لے کر ستاروں تک تمام چیزیں خدا کا عطیہ ہیں۔

ان بے شمار اعلیٰ چیزوں کو دیکھ کر ایک طرف اللہ کی عظمت کا احساس ابھرتا ہے۔ دوسری ف انسان کے سینہ میں یہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھ کو ہر ورت اور ہر راحت کی چیز انتہائی وافر مقدار میں فراہم کر دی، جب کہ میں ان میں سے کسی چیز کو ں پیدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یہ احساسات آدمی کے اندرونی وجود میں طوفان بن کر ٹھتے ہیں اور پھر اعتراف کے کلمات کی صورت میں اس کی زبان سے بے تابانہ نکل پڑتے ب، اسی کا نام شکر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث نہایت سبق آموز ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت م احمد اور امام الترمذی نے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خص انسانوں کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرے گا (من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامت کیا ہے جو یہ بتاتی ہے کہ آدمی کے اندر شکر خداوندی کیفیت موجود ہے یا نہیں۔ وہ علامت شکر انسانی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر انسانوں کا شکر کرنے مزاج پایا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کے اندر اللہ کا شکر ادا کرنے کی صفت بھی موجود ہے۔ اور ر یہ دکھائی دے کہ لوگ انسانی احسان کا شکر ادا کرنے کی صفت سے خالی ہو گئے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے ہ خداوندی احسان کا شکر ادا کرنے کی صفت سے بھی خالی ہیں۔

روح دین

ایک سفر کے دوران مجھے ایک ایسے ملک میں جانا پڑا جہاں پہلے بادشاہی نظام تھا۔ ا
بادشاہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہاں صدر راج قائم ہے۔ قدیم شاہی محل کی تمام شان وشوکت
ہے۔ البتہ اب اس کو شاہی محل کے بجائے صدارتی محل کہا جاتا ہے۔

میں اور کانفرنس کے دوسرے شرکاء صدر مملکت سے ملاقات کے لیے صدارتی مح
لے جائے گئے۔ ہم لوگ جب اس پُرہیبت عمارت میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہر
کا انداز اچانک بدل گیا ہے۔ لوگوں پر خاموشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ ان کی رفتار سست
چہرے پر سنجیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ محل کی ہر چیز کو وہ پُر رعب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی خدا کا ایک عظ
محل ہے۔ اس میں ہر طرف خدا کی عظمت وقدرت کے جلوے نمایاں ہیں۔ اس خدائی محل کے
چلتے ہوئے مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر وہ کیفیت طاری ہونا چاہیے جو کسی شاہی محل کے
چلتے ہوئے اس کے اندر طاری ہوتی ہے۔

مگر جب میں دنیا کے راستوں میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کر
میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہاں لوگ اس طرح چل رہے ہیں گویا کہ انھیں
عظیم حقیقت کی کوئی خبر ہی نہیں۔ لوگوں کے چہروں پر خشوع جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا جو از رو
واقعہ ان کے چہروں پر جھلکنا چاہیے۔

لوگوں کے چہروں پر مجھے احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال تواضع
بجائے سرکشی کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بے حسی کا غلبہ دکھ
دیتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا سنجیدہ بھی نظر نہیں آتے جتنا کوئی شخص کس
ایوان صدارت یا کسی قصر شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ انسانی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہو مگر خدائی مح
میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے آج ہی دور ہو گئے۔

زمانہ کا فرق

چمگادڑ کی عادت ہے کہ وہ عام چڑیوں کی طرح نہیں بیٹھتا۔ بلکہ بیٹھنے والی جگہ کو پیروں سے پکڑ کر لٹک جاتا ہے۔ چمگادڑ کی یہ عادت قدیم زمانہ میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ وہ شاخ یا اس قسم کی دوسری چیزوں پر لٹکتا اور پھر جب چاہتا اڑ جاتا۔

مگر اب بجلی کے زمانہ میں چمگادڑ کی یہ عادت اس کے لیے موت کا سبب بن گئی ہے۔ عام چڑیاں اب بھی بجلی کے تار پر بیٹھتی ہیں اور اڑ جاتی ہیں۔ مگر چمگادڑ بجلی کے تار پر آتا ہے تو وہ اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کا صرف ایک تار چھونا خطرناک نہیں ہے۔ خطرناک یہ ہے کہ اس کے دونوں تاروں کو بیک وقت چھوا جائے۔ عام چڑیاں صرف ایک تار پر بیٹھتی ہیں۔ ان کا تعلق دوسرے تار سے ہونے نہیں پاتا اس لیے وہ محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے برعکس چمگادڑ اپنی عادت کی وجہ سے تار کو پکڑ کر لٹکتا ہے۔ قدرتی طور پر اس کا جسم دوسرے تار کو بھی چھونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے شارٹ سرکٹنگ ہوتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔

چمگادڑ کے لیے یہ عذر ہے کہ اُس کو زمانہ کے اِس "فرق" کا پتہ نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی غلطی اکثر وہ انسان کرتا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے عقل اور شعور دیا ہے۔ وہ زمانہ کے فرق کو جاننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ چمگادڑ ہے نہ کہ عقل و ہوش والا انسان۔

موجودہ زمانہ میں جو فرق پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک فرق یہ ہے کہ آج کا زمانہ کسی انسان کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ مگر تشدد کو وہ مکمل طور پر جرم قرار دیتا ہے۔ ماضی میں یہ فرق اتنی واضح صورت میں موجود نہ تھا۔ اب جو لوگ اس فرق کو سمجھیں وہ امن کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کریں گے، وہ تشدد کے دائرہ میں داخل نہ ہوں گے اور اس طرح کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے ماضی کے ذہن کی بنا پر اس فرق کو نہ سمجھیں وہ اپنی جدوجہد میں اس کو ملحوظ نہ رکھیں گے۔ وہ امن کے دائرہ سے گزر کر تشدد کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے، اور نتیجۃً ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

۹ الرسالہ جون ۱۹۹۳

انسان کی تبدیلی

دنیا کے وہ تمام لوگ جن کی طرف بڑی بڑی فتوحات کو منسوب کیا جاتا ہے، ان کی فتوحات صرف سیاسی فتوحات ہیں۔ انھوں نے حکومتوں کو بدلا، مگر وہ انسان کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ کی تمام کامیاب مثالیں تبدیلیٔ حکومت کی مثالیں ہیں نہ کہ تبدیلیٔ انسان کی مثالیں۔ ہندستان میں بظاہر ایک "مہاتما" کے ذریعہ نظام کی تبدیلی عمل میں آئی۔ مگر ہندستان کی مثال بھی اس معاملہ میں کچھ مختلف نہیں۔ یہاں ۱۹۴۷ میں حکومت بدلی۔ بدیسی حکمرانوں کے بجائے دیسی حکمراں اقتدار پر قابض ہو گیے۔ مگر جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر حکومتوں کی تبدیلی حالات کی تبدیلی کے ہم معنی نہیں بنتی۔ بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے بعد جو نیا نظام بنتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ برا ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ——— انقلاب اس کامیاب کوشش کا نام ہے جس کے ذریعہ ایک خراب حکومت سے نجات پاکر ایک خراب تر حکومت اپنے اوپر مسلط کر لی جائے:

A revolution is a successful effort to get rid of a bad government and set up a worse.

پوری تاریخ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال واحد مثال ہے جب کہ صرف حکومت نہیں بدلی، بلکہ اسی کے ساتھ انسان بھی مکمل طور پر تبدیل ہو گیے۔

اس کا بنیادی سبب پیغمبر اور سیاسی لیڈر کے طریق کار کا فرق ہے۔ لیڈر ہمیشہ سیاسی اور معاشی مسائل کو لے کر اٹھتا ہے۔ وہ عوام کو وقت کے حکمراں کے خلاف بھڑکا کر اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبر آخرت کے مسائل کو لے کر اٹھتا ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف سوچنے کا پیغام دیتا ہے۔ لیڈر احتساب غیر کی بنیاد پر تحریک چلاتا ہے اور پیغمبر احتساب خویش کی بنیاد پر۔ انھیں دونوں لفظوں میں دونوں کے انجام کا فرق چھپا ہوا ہے۔

پیغمبر کا اسوہ اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ حکومتوں کو توڑنا کوئی کام نہیں۔ انسان کو بدلو، اس کے بعد حکومت کا نظام اپنے آپ بدل جائے گا۔

۱۰ الرسالہ جون ۱۹۹۳

سب سے بڑی ناقدری

آدمی کے اندر ایک سوئی کے زخم کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں، اس کے باوجود آدمی اتنے بڑے بے جرم کرتا ہے کہ اگر اس کو بلڈوزر کے نیچے ڈال کر پیس دیا جائے اور ہزار سال تک پیسا جاتا رہے۔ تب بھی وہ اس کی سزا کے لیے کافی نہ ہو ——— ایک آہ کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان سے نکلے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزادی دی، اور اسی کے ساتھ اس کو اچھے اور برے کی تمیز عطا فرمائی۔ انسان کو اس طرح اس لیے پیدا کیا گیا تاکہ وہ خود اپنے ارادہ سے برائی کو چھوڑ دے اور اچھائی کو پکڑ لے۔ وہ اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت سرکشی سے بچے اور فرماں برداری کے طریقہ کو اپنا طریقہ بنائے۔

یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے ترقی اور کامیابی کا عظیم الشان موقع کھولنا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو وہ سب سے بڑا انعام دیا جائے جو وسیع کائنات میں کسی بھی دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ یعنی سرکشی کا امکان ہوتے ہوئے خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اللہ کی ماتحتی میں دیدینا۔ یہ اللہ کے نزدیک انتہائی پسندیدہ عمل تھا۔ چنانچہ اللہ نے اس کے بدلہ میں انسان کے لیے ایسی ابدی جنتیں مقدر کیں جن سے زیادہ نفیس اور راحت چیز تصور کے درجہ میں بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مگر انسان کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو اس واقعہ کی خبر ہی نہیں، جیسے کسی کو اس ربانی منصوبہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو فرصت ہی نہیں کہ وہ اس امکان کو جانے اور اس قیمتی موقع کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ تمام لوگ آنکھیں بند کر کے جہنم کی طرف بھاگے جا رہے ہیں، کسی کو جنت کے دروازے کی طرف دیکھنے کی جیسے فرصت ہی نہیں۔

یہ گویا خدا کی پکار کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ خدا کی میزبانی کو قبول نہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی ناقدری ہے جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی ناقدری کا انجام سب سے بڑی سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

آہ وہ دنیا جہاں لوگ جہنم کا لفظ بولیں مگر کوئی جہنم سے ڈرنے والا نہ ہو۔ جہاں لوگ جنت کا نام لیں مگر کوئی نہ ہو جو جنت کی سچی طلب سے اپنے سینہ کو آباد کیے ہوئے ہو۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا اور کیسی عجیب ہوگی اس دنیا کے بعد آنے والی آخرت۔

امن کمیٹی

دہلی کے اردو روزنامہ قومی آواز (۱۹ جنوری ۱۹۹۲) میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے: مسجد، مندر سے لاوڈ اسپیکر ہٹا لینے کا کولھاپور میں متفقہ فیصلہ۔ پوری خبر اس طرح ہے:

"مسلم مذہبی رہنماؤں اور بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں نے مسجدوں سے لاوڈ اسپیکر ہٹانے کا اور مہا آرتی فوراً ختم کر دینے کا متفقہ فیصلہ کر لیا ہے۔

ضلع مجسٹریٹ کے ترجمان نے بتایا کہ ۱۶ جنوری کو ضلع کلکٹر اجیت کمار جین کی جانب سے امن کی اپیل کے جواب میں گزشتہ رات یہاں مسلم مذہبی رہنماؤں اور آمھی بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ ترجمان نے کہا کہ لاوڈ اسپیکروں کے ذریعہ نماز اور مہا آرتی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتہ سے شہر میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں شہر میں آتش زنی اور پتھراؤ کی وارداتوں کی اطلاعات مل رہی تھیں۔

ضلع کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس فیصلہ کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے شہر میں امن اور بھائی چارہ برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ (صفحہ ۱)

یہ ایک خوش کن چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ باہمی اختلاف پیش آنے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ اپنے اختلافات کو بھائی چارہ کے اصول پر حل کریں گے۔

ضرورت ہے کہ ہر شہر اور ہر بستی میں امن کمیٹی بنائی جائے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے بزرگ لوگ شامل ہوں۔ جب بھی دونوں فرقوں میں کوئی اختلافی بات پیش آئے یا کسی بات پر تناؤ کی فضا ہو تو فوراً امن کمیٹی کے لوگ بیٹھ کر مشورہ کریں۔ اور باہمی مشورہ سے معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

امن کمیٹی اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ تجربہ ہے کہ جہاں کہیں بھی امن کمیٹی بنائی گئی وہاں وہ فساد کے خلاف ایک طاقتور چیک بن گئی۔ اسی کامیاب تجربہ کو ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے، خواہ وہ چھوٹی جگہ ہو یا کوئی بڑی جگہ۔

فرق کو جانئے

رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷ - ۱۸۹۲) اردو کے مشہور ادیب تھے۔ وہ مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ آل احمد سرور نے ان کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے :

ڈاکٹر ضیاء الدین نے نظام حیدر آباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا، اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجئے گا، پسند نہ آئے گا۔" بولے "کیوں"۔ میں نے کہا : "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ، ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئے گا۔" یہی ہوا۔ ایڈریس سن کر کہنے لگے "کچھ جنچا نہیں، پھر کوشش کیجئے۔" رشید صاحب نے نظر ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا: "مغلوں کے عہد نے ہندستان کو تین تحفے دیے۔ تاج محل، غالب اور دولت آصفیہ۔" اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدر آباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبین پر شکن ہی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجئے۔" اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے، اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر اردو شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے، تو ایسے شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

(رشید احمد صدیقی، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۴۲)

ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) ایک سائنس داں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے اس تبصرہ میں ایک غیر سائنسی بات کہی۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ایڈریس اور قصیدہ میں فرق نہیں کیا۔ شعبۂ اردو جس مضمون کو تیار کرنے میں "ناکام" ہوا تھا، وہ مدحیہ قصیدہ تھا نہ کہ فی الواقع ایڈریس۔ اس کا تیار کردہ مضمون پورے معنوں میں ایڈریس تھا، البتہ وہ مدحیہ قصیدہ نہ تھا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرے۔ عام طور پر لوگ اس طرح فرق کر کے نہیں سوچ پاتے، اس لیے وہ اکثر رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ ایک صورتِ معاملہ پر دوسری صورتِ معاملہ کو قیاس کر لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔

ہندو مسلم ڈائیلاگ

ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۹۷۸-۱۸۹۶) نے اپنی کتاب مسلمانان ہند کی تقدیر The Destiny of Indian Muslims میں یہ نشاندہی کی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو انقلاب آیا ہے، اس کے بعد یہاں کے سماجی اور سیاسی حالات میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ اب انڈیا میں جمہوریت کا نظام ہے۔ مگر ہندستانی مسلمان ابھی تک قدیم حاکمانہ دور میں سوچ رہے ہیں۔ سوچ کا یہ پچھڑا پن ہی ان کے تمام مسائل کا بنیادی سبب ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے برٹش دور میں ان کا سابقہ ایک ایسی گورنمنٹ سے تھا جو یہاں کے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ اس کی حیثیت ایک مختار کل (Supreme Arbiter) کی سی تھی جو عوام کی مرضی کا لحاظ کیے بغیر کارروائی کر سکتی تھی۔ مگر اب انڈیا ایک جمہوریت ہے۔ اب یہاں کے حکمراں کو عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ یہاں کے عوام سے اپنے معاملات طے کریں نہ کہ حکمرانوں سے۔

مگر انڈیا کے مسلمان اب بھی اپنے معاملات میں حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ آج بھی اپنے مسائل کو گورنمنٹ کے پاس لے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے مسائل کو حل کر دے گی:

But Muslims still labour under the impression that solution of their problems is in the hands of the Government. To the Government alone they take their troubles and from it alone they expect a remedy (p.295).

مسلمانان ہند کی جدید تاریخ کے بارہ میں یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ اور بابری مسجد اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک اس کی بدترین مثال ہے۔ ۱۹۸۶ کے بعد مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے جس طرح بابری مسجد تحریک کو چلایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے اس اشو پر ہندو عوام سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا، اور حکومت کی یہ ذمہ داری سمجھی کہ وہ ان کی طرف سے کافی ہو جائے اور اس معاملہ میں مختار کل بن کر ان کے حق میں فیصلہ دیدے۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ نے بتایا کہ یہ مفروضہ سراسر غلط تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر

میں وزیر اعظم ہند نے اعلان کیا کہ وہ بابری مسجد کو ڈھانے نہیں دیں گے۔ دسمبر میں انھوں نے پولیس فورس کی دس کمپنی (۲۰ ہزار سے زیادہ) اجودھیا کی سرحد پر پہنچادیں اور بہت سے دوسرے سرکاری انتظامات کیے۔ مگر عملاً وہی ہوا جو ہندو عوام چاہتے تھے ——— ۶ دسمبر کو کارسیوکوں نے اجودھیا میں گھس کر بابری مسجد کو ڈھا دیا، انھوں نے اس کا ایک ایک پتھر وہاں سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد انھوں نے عین اسی جگہ پر ایک عارضی مندر بنا دیا۔ مزید یہ کہ انھیں اس کی بھی عدالتی اجازت مل گئی کہ وہ اس نئے مندر میں رام للا کی مورتیاں رکھ کر اس کا درشن اور پوجا شروع کر دیں۔

یہ واقعہ واضح طور پر حکومت کے اوپر عوام کی برتری کا ثبوت ہے۔ وہ آخری طور پر ثابت کر رہا ہے کہ اس ملک میں برتر حیثیت عوام کو حاصل ہے نہ کہ ان افراد کو جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر محدود مدت کے لیے وزارت بناتے ہیں۔ اب عقل و تدبر سے خالی ہی کوئی شخص یہ یقین کر سکتا ہے کہ جو مرکزی حکومت بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو توڑے جانے سے نہ بچا سکی وہ مرکزی حکومت ایسا کر سکتی ہے کہ نئے بنے ہوئے مندر کو بزور توڑے، اس میں نصب شدہ رام کی مورتیوں کو ہٹائے، اور پھر عین اسی جگہ پر دوبارہ بابری مسجد بنا کر کھڑی کر دے۔

مگر حیرت انگیز بات ہے کہ یہ کھلا ہوا واقعہ بھی مسلمانوں کے نااہل لیڈروں کی بے خبری کو توڑ نہ سکا۔ جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہو چکا ہے، ۵ اپریل ۱۹۹۳ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تقریباً ڈیڑھ درجن ممتاز افراد دہلی میں جمع ہوئے۔ انھوں نے اتفاق رائے سے ایک میمورنڈم تیار کیا۔ اس میمورنڈم میں یہ مانگ کی گئی تھی کہ حکومت اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو اور مورتیوں کو ہٹائے اور بابری مسجد کو اس کی سابقہ جگہ پر دوبارہ تعمیر کرے۔ اس کے بعد یہ وفد وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ سے ملا اور مذکورہ میمورنڈم کو ان کے حوالے کیا۔

یہ بلاشبہ خلاف زمانہ عمل Anachronism کی بدترین مثال ہے۔ ۶ دسمبر کے واقعہ سے مسلمانوں کو سب سے بڑا سبق یہ لینا چاہیے تھا کہ اب انھیں ہندو عوام کی طرف جانا ہے۔ اب انھیں اپنی کوششوں کا رخ ہندو جنتا کی طرف کرنا ہے نہ کہ دہلی میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کی طرف۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے نادان رہنما بدستور دہلی کا طواف کرنے میں مشغول ہیں۔

۱۵ الرسالہ جون ۱۹۹۳

ایسی حالت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد نے یہ ناقابل فہم نادانی کیوں کی کہ انھوں نے وزیر اعظم سے مل کر یہ مطالبہ کیا کہ مندر کو توڑ کر دوبارہ وہیں مسجد بناؤ۔ اس کی واحد وجہ ان کی بے شعوری ہے۔ وہ ابھی تک پچاس سال پہلے والے ہندستان میں سوچ رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ آج انڈیا میں عوام کی حکومت ہے نہ کہ کسی مطلق العنان بادشاہ کی حکومت۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی اس روش کو بدلیں۔ وہ حکومت یا ایڈمنسٹریشن کی طرف دیکھنے کے بجائے ہندو عوام کی طرف دیکھیں۔ مسلم رہنما ہندو رہنما سے ملیں۔ مسلم عوام اور ہندو عوام میں زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ ہر سطح پر ہندو اور مسلم میل جول کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ تاکہ دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں دور ہوں۔ تاکہ باہمی تناؤ کے حالات ختم ہوں اور دونوں فرقے خوش گوار تعلقات کے ساتھ مل کر رہنے لگیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ہمارے مسائل کا حل مسلم۔ حکمراں ملاقات نہیں ہے بلکہ مسلم۔ ہندو ملاقات ہے۔ آج شدید ترین ضرورت ہے کہ کل ہند سطح کا ایک ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس میں دونوں فرقوں کے سنجیدہ اور بااثر افراد جمع ہوں۔ اس کا مقصد خالص غیر سیاسی انداز میں امن کی تلاش ہو۔

اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے لوگ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات رکھیں۔ وہ کوشش کریں کہ باہمی نزاع کی صورت حال ختم ہو اور وہ مشترک بنیاد دریافت کی جائے جس کو اختیار کر کے دونوں فرقے اچھے پڑوسی کی طرح ایک ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ڈائیلاگ اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ اسلام کی تاریخ میں حدیبیہ کا واقعہ اسی قسم کا ایک کامیاب ڈائیلاگ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت (۶۲۲ء) کے بعد قدیم عرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے۔ کئی جنگیں اور جھڑپیں واقع ہوئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آخر کار پیغمبر اسلام نے ۶۲۸ء میں مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر تقریباً دو ہفتہ قیام کیا۔ یہاں آپ نے مکہ کے غیر مسلم سرداروں سے گفتگو کی۔ اور پھر ان کی اکثر شرطوں کو مانتے ہوئے

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک امن معاہدہ پر دستخط کیے جو کہ اسلام کی تاریخ میں معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ ڈائیلاگ اگر فی الواقع سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ کیا جائے تو وہ ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ انڈیا کی تاریخ آج جہاں رکی ہوئی ہے وہ ہندو مسلم تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ ایک بار حل ہو جائے تو اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہونے کے بعد کوئی بھی دوسری چیز انڈیا کی ترقی کو روکنے والی نہیں۔

ڈائیلاگ کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ دونوں فریق ڈائیلاگ کو مناظرہ نہ بنائیں۔ وہ اپنے اپنے فرقہ کے وکیل بن کر نہ بولیں بلکہ یہ سوچ کر بولیں کہ وسیع تر قومی مفاد کس چیز میں ہے، اور ملک کی مشترک بھلائی کا راستہ کیا ہے۔

دونوں فریق کو اپنے آپ سے یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ اشوز اور نان اشوز میں فرق کریں گے۔ وہ کسی معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ وہ کلیم اور کاونٹر کلیم کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے۔ وہ جو بھی کہیں گے رزلٹ کو سامنے رکھ کر کہیں گے۔ ان کا انداز خیر جانب داری کا ہوگا نہ کہ طرفداری کا۔ وہ منوانے کے ساتھ ماننے کے لیے بھی تیار رہیں گے۔ وہ دوسرے سے لینا بھی چاہیں گے اور دوسرے کو دینا بھی۔

ڈائیلاگ کوئی حریفانہ میٹنگ نہیں، وہ برادرانہ میٹنگ ہے۔ اس کو ہار جیت کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد معاملہ کو سلجھانا ہوتا ہے نہ کہ معاملہ کو الجھانا۔ ڈائیلاگ کے پیچھے مفاہمت کا جذبہ ہونا چاہیے نہ کہ مقابلہ کا جذبہ۔

ڈائیلاگ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی معاملہ کو ٹکراؤ کے بجائے بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اگر اس اسپرٹ کے ساتھ ڈائیلاگ شروع کیا جائے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا دروازہ تقریباً آدھی صدی سے بند پڑا ہوا ہے۔ اور یہ ڈائیلاگ اس بند دروازہ کو یقیناً کھول سکتا ہے، بشرطیکہ اس کو سچی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے۔

نئے عہد کے دروازہ پر

۱۹۴۶ میں جب انڈیا کے بٹوارہ کا فیصلہ ہوگیا تو مہاتما گاندھی نے طے کیا کہ وہ پاکستان جائیں گے۔ یہ سفر ایک مشن کے لیے تھا۔ اور یہ مشن ان کے اپنے الفاظ میں ہندو۔ مسلم دشمنی (Hindu-Muslim antagonism) کو ختم کرنا تھا۔ اس وقت وہ ۷۷ سال کے ہو چکے تھے انھیں کلکتہ سے نواکھلی جانا تھا جو ان کے لیے بے حد مشکل راستہ تھا۔ مگر وہ مشکلات سے بے پروا ہو کر نواکھلی گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی یادداشت میں ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو یہ الفاظ تحریر کیے :

My present mission is the most difficult and complicated one of my life... I am prepared for any eventuality. 'Do or Die' has to be put to the test here. 'Do' here means Hindus and Mussulmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt.

(Louis Fischer, *The Life of Mahatama Gandhi*, p.449)

میرا موجودہ مشن بے حد مشکل مشن ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ پیچیدہ مشن ہے۔ میں کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرے لیے 'کرو یا مرو' کا امتحان ہے۔ کرنے کا مطلب اس وقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ امن اور دوستی کے ساتھ باہم مل کر رہیں۔ ورنہ میں اس کی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا (صفحہ ۴۴۹)

مہاتما گاندھی نے اس معاملہ کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہی واحد چیز تھی جس پر ملک کے مستقبل کا انحصار تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو یا تو باہم مل کر ترقی کرنا تھا یا دونوں کو برباد ہو جانا تھا۔ بعد کو پیش آنے والے حالات نے مہاتما گاندھی کے اس نظریہ کی مکمل تصدیق کر دی ہے۔

انڈیا میں ہندو۔ مسلم مسئلہ اتنا زیادہ پیچیدہ کیوں بن گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈیا کی آبادی میں ہندو ۸۰ فی صد ہیں اور مسلمان ۱۵ فی صد۔ بقیہ فرقے صرف ایک دو فی صد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں نکسٹ ٹو مجاریٹی (بعد از اکثریت) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ عام سماجی اصول ہے کہ جہاں ایک گروہ مجاریٹی میں ہو اور دوسرا گروہ نکسٹ ٹو مجاریٹی کا درجہ

رکھتا ہو تو وہاں ایسے دو گروہوں کے درمیان حریفانہ کش مکش کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان مستقل طور پر فرضی یا حقیقی مسائل چھڑے رہتے ہیں۔

انڈیا میں ہندو اور مسلم مسئلہ کا اصل سبب یہی نزاکت ہے۔ ہندو یہاں مجاریٹی میں ہیں اور مسلمان یہاں نکسٹ ٹو مجاریٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں یہ مسئلہ ہر سماج میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نقصانات سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کے بارہ میں لوگوں کو باشعور بنا دیا جائے۔ باشعور آدمی اپنی تعمیری سوچ کی بنا پر ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے جن سے بے شعور آدمی اپنے آپ کو بچا نہیں پاتا۔

دو طرفہ معاملہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اکثریتی فرقہ کے جن لوگوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھانچہ کو ڈھایا تھا، وہ بطور خود سمجھ رہے تھے کہ یہ معاملہ ان کے لیے یک طرفہ معاملہ ہے۔ مگر اس کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو اقلیتی فرقہ کے کچھ ناراض افراد نے جب بمبئی میں تیرہ طاقتور بموں (High-tech bombs) کا بھیانک دھماکہ کر کے ملک کی اقتصادی راجدھانی کو ہلا دیا تو معلوم ہوا کہ یہ معاملہ دو طرفہ ہے۔ پہلا فرقہ اگر دوسرے فرقہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو دوسرا فرقہ بھی نقصان پہنچانے کے معاملہ میں پہلے فرقہ سے کم نہیں۔ چنانچہ بمبئی کے بم دھماکوں (Bomb blasts) کے بعد آر ایس ایس کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۲۸ مارچ ۱۹۹۳) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی جو رپورٹ چھاپی ہے، اس کی سرخی بامعنی طور پر یہ قائم کی گئی ہے ——— ہم کتنے محفوظ ہیں :

How safe are we?

اس حقیقت کا اعتراف دوسرے بہت سے مبصرین نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر بزرگ صحافی مسٹر کلدیپ نائر (ریڈئنس ۴-۱۰ اپریل ۱۹۹۳) نے بمبئی کے حادثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ایک چیتاونی ہے کہ اگر آبادی میں ۱۲ فی صد کی تعداد رکھنے والا گروہ تباہ کیا جا سکتا ہے تو ۸۲ فی صد کی تعداد رکھنے والے ہندو بھی نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتے :

It is a warning that if they, the 12 per cent of the population, are sought to be destroyed, the 82 per cent of the Hindus will not stay unhurt.

اس دنیا میں جمہوری طاقت اور تشدد کی طاقت کے درمیان لازمی طور پر کوئی برابری نہیں ہے۔ اکثریت اور اقلیت کے درمیان عددی تناسب کے اعتبار سے یقیناً فرق ہوتا ہے۔ مگر تخریب کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ ایک گروہ جتنی تخریب کاری کر سکتا ہے، دوسرا گروہ بھی یقینی طور پر اتنی ہی یا اس سے زیادہ تخریب کاری کر سکتا ہے۔ اس لیے اب آخری وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ پر از سر نو غور کیا جائے اور اس کا کوئی قابل عمل حل تلاش کیا جائے، اس سے پہلے کہ بربادی کی وہ حد آجائے جس کے بعد تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

اولاً ۶ دسمبر اور اس کے بعد ۱۲ مارچ کے واقعہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ دوگونہ نوعیت کا ایک مسئلہ ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے، وہ دونوں میں سے کسی کے لیے بھی یک طرفہ برتری کا مسئلہ نہیں۔

اس مسئلہ کی سنگینی یہ ہے کہ ہندو اپنی اکثریتی طاقت کی بنا پر مسلمان کے لیے ایک مستقل چیلنج ہے، مسلمان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہندو سے اس کی یہ حیثیت چھین سکے۔ دوسری طرف مسلمان اپنی تمام تر عددی کمی کے باوجود، یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ہندو کے لیے ازعاج (nuisance) پیدا کر سکے۔ اور ہندو بھی کسی حال میں مسلمان سے اس کی یہ حیثیت چھیننے پر قادر نہیں۔

اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے سامان تشویش (concern) بن گئے ہیں۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ دونوں ہی ٹھنڈے دل کے ساتھ اس معاملہ پر غور کریں اور دو طرفہ مفاد (mutual interest) کی خاطر اس کا کوئی مستقل حل نکالیں۔ ورنہ اگر یہی حالات باقی رہے تو دونوں اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی ترقی کی منزل تک پہنچنے والا نہیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ان حالات میں میری تجویز ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندہ افراد کے درمیان ایک موثر قسم کا ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ ہندو۔ مسلم جھگڑے کو اس

ک سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے نمائندہ افراد
ع ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ باہم تبادلۂ خیال کریں۔ وہ ہمدردی کے جذبہ کے تحت
یک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں۔ اس ڈائیلاگ میں وہ اپنے فرقہ کے محدود مفاد سے زیادہ
یش کے عمومی مفاد کو اپنے سامنے رکھیں۔ وہ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے بھائی بھائی کی
نند گفتگو کریں۔

ڈائیلاگ کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ دونوں فریق حقیقت پسندی اور ملک کے وسیع تر
فاد کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کا ایک ایجنڈا تیار کریں۔ اس میں مشترک نوعیت کی بالکل ضروری
تیں درج ہوں۔ یہ ایجنڈا منصفانہ بھی ہو اور فائنل بھی۔ اس ایجنڈے کی بنیاد پر دونوں کے
رمیان سنجیدہ گفتگو ہو۔ اور پھر دو اور لو (Give and take) کے اصول پر تمام باہمی
زاعات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ڈائیلاگ کے لیے حالات پوری طرح سازگار
ہو چکے ہیں۔ حالات کی اسی سازگاری سے حوصلہ افزا اثر لیتے ہوئے ہندستان ٹائمس
(۹ اپریل ۱۹۹۳) نے اپنے اڈیٹوریل میں اس کی موثر وکالت کی ہے۔ اس اڈیٹوریل کا عنوان
ہے ——— تحمل کی ضرورت :

Need for restraint

اس سلسلہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ پوری طرح ڈائیلاگ کے موڈ میں
نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جزئی طور پر اس اسپرٹ کا مظاہرہ بھی کیا ہے جو ڈائیلاگ کو کامیابی
ک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، بمبئی میں ہندو صاحبان کی یہ مانگ تھی
ہندو محلوں میں واقع مساجد میں رات کے وقت لاوڈ اسپیکر پر اذان نہ دی جائے۔ یا جمعہ
کے دن سڑک کے اوپر نماز ادا نہ کی جائے۔ یہ بات سالہا سال سے چل رہی تھی مگر کوئی فیصلہ
نہیں ہو پاتا تھا۔ ۱۹۹۲ کے آغاز میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور
باہمی رضامندی سے ایک متفقہ فیصلہ کر لیا گیا۔

اس معاملہ میں جہاں تک ہندو صاحبان کا تعلق ہے، اپنے مذہب کے زیر اثر ان کا

مزاج عام طور پر روادار رہا ہے۔ تاہم بھارتیہ جنتا پارٹی کے عروج کے بعد ہندوؤں کے ایک طبقہ میں کسی قدر جارحانہ مزاج پیدا ہو گیا تھا جو کامیاب ڈائیلاگ کے راستہ میں رکاوٹ تھا۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد سامنے آنے والے حالات نے انھیں اپنے رویہ پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اب ان کے اندر بھی وہ حقیقت پسندی آگئی ہے جو ڈائیلاگ کی کامیابی کے لیے ہمیشہ ضروری ہوتی ہے۔ اپریل ۱۹۹۳ کے دوسرے ہفتہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل ایگزی کیٹیو کی میٹنگ (کلکتہ) بھی اس معاملہ میں ایک حوصلہ افزا مثال ہے۔ کیوں کہ اس میٹنگ میں پارٹی کے اعلیٰ ذمہ داروں نے طے کیا ہے کہ وہ ٹکراؤ اور جارحیت کے طریقہ کو چھوڑ کر امن اور مفاہمت کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں گے۔

آخری چارۂ کار

اس ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ کو اس عزم کے ساتھ منعقد ہونا چاہیے کہ اس کو بہر حال نتیجہ خیز بنانا ہے۔ اس کو کسی بھی حال میں "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق نہیں ہونے دینا ہے، اور اگر عزم صحیح ہو تو ایسا ہونا کچھ بھی مشکل نہیں۔

اس ڈائیلاگ کا پہلا مطلوب نشانہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دونوں فرقے ایک مشترک اتفاق نامہ تک پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ہو تو بلاشبہ یہ پوری ہندستانی قوم کے لیے نہایت خوش قسمتی کی بات ہوگی، اور ہم سب کو اس کے حق میں خدا سے اسی کی دعا کرنا چاہیے۔

لیکن بالفرض اگر اس سے اس قسم کا مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو، اور ڈائیلاگ کی کارروائی بتائے کہ دو طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کا حل نکلنے والا نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں آخری چارہ کار کے طور پر میں اپنے مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے پیغمبر کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اس کے لیے تیار ہو جائیں کہ وہ یک طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کو ختم کر دیں گے تاکہ ملک میں امن وامان قائم ہو، اور اس خطہ ارض میں بسنے والے تمام لوگ معتدل حالات میں زندگی گزارنے کا موقع پا سکیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سالہ دعوتی عمل کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس ہجرت کے بعد بھی ایسا نہ ہو سکا کہ دونوں فریق کے درمیان جھگڑا ختم ہو جائے اور اہل عرب

و پُرامن زندگی کے مواقع حاصل ہو جائیں۔ حتیٰ کہ معاملات اس نوبت کو پہنچ گئے کہ بالکل ظاہر ہو گیا کہ یہ نزاع دو طرفہ بنیاد پر ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حریف طبقہ کی تمام شرطوں کو مانتے ہوئے یک طرفہ بنیاد پر اس نزاع کا خاتمہ کر دیا۔ ختم نزاع کا یہی وہ عمل ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے وقت اعلان کیا تھا کہ قریش (فریق مخالف) آج مجھ سے جس چیز کے لیے بھی کہیں گے جس میں کہ قرابت داری پائی جاتی ہو تو وہ چیز ضرور میں انھیں دوں گا (لاتدعونی قریش الیوم الی خطۃ یسألوننی فیہا صلۃ الرحم الا اعطیتہم ایاہا) سیرۃ ابن ہشام ۳/ ۳۵۸

میرا مشورہ ہو گا کہ ایسی صورت میں مسلمان اس اسوۂ رسول کی اسپرٹ پر عمل کرتے ہوئے برادران وطن سے یہ کہہ دیں کہ ملک میں شانتی لانے کی خاطر ہم ہر اس شرط کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس سے انڈیا کا وقار اور اس کی اعلیٰ روایتیں باقی رہتی ہوں، جو دیش کی مجموعی ترقی کا راستہ کھولنے والا ہو۔

مسلمان بھائیوں کے اطمینان کے لیے مزید میں کہوں گا کہ اس طرح کا تصفیہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے، وہ کبھی بھی مستقل یا ابدی نہیں ہوتا۔ مسلمان اگر اس معاملہ میں یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ پر راضی ہو جائیں تو وقتی طور پر بظاہر یہ ان کے لیے کھونے کا واقعہ دکھائی دے گا۔ مگر عین ممکن ہے کہ مستقبل کے لحاظ سے وہ ان کے لیے نئی، زیادہ بڑی کامیابی کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی بن جائے۔

دو مثالیں

اس کی عملی مثالیں قریب کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ (اور اس کے حلیفوں) نے جرمنی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسی طرح امریکہ کی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ اور جنرل میکارتھر نے جاپانی قوم کے لیے ایک نیا دستور تیار کیا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جاپان آئندہ کبھی بھی اور کسی اعتبار سے بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ (10/87)

جرمنی اور جاپان کے مدبروں نے محسوس کیا کہ اب ان کے لیے دو میں سے ایک انتخاب ہے۔ یا تو وہ امریکہ اور اس کے حلیفوں سے جنگ جاری رکھیں اور اس کے نتیجہ میں بدستور تباہ ہوتے رہیں۔ یا یک طرفہ طور پر وہ فریق ثانی کی شرطوں کو مان لیں۔ انھوں نے پہلا انتخاب کو چھوڑ کر دوسرے انتخاب کو لے لیا۔

یہ بظاہر یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ تھا۔ مگر اس کا نتیجہ اتنا بڑا نکلا کہ چالیس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ جرمنی ہمیشہ سے زیادہ طاقت ور ہو کر دوبارہ متحد ہو گیا۔ اسی طرح جاپان بھی پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہو کر اس حالت میں آگیا کہ وہ خود امریکہ کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دے۔

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ کوئی ہار کا معاملہ نہیں۔ قرآن (الفتح ۱) کے مطابق، وہ عین جیت کا معاملہ ہے۔ یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ اپنے پہلے روز ہی فریق ثانی کے اوپر اخلاقی فتح ہے۔ اور اگر مزید دانش مندی کا ثبوت دیا جائے تو بعد کے مرحلہ میں مادی فتح بھی۔

یہاں ایک اضافہ بہت سبق آموز اور بہت بامعنی ہے۔ آر ایس ایس کے ہفتہ وار انگریزی میگزین آرگنائزر (دہلی) نے اپنے شمارہ ۲۵ اپریل ۱۹۹۳ میں ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے۔ راقم الحروف کی تجویز ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ کے بارہ میں ہے۔ تجویز کے تعارف اور تبصرہ کے بعد آخر میں اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں لکھا ہے :

Thus a Muslim leader, however well-meaning and well-intentioned in quest of peace, must search for a precedent in Hadis for talks with the non-Muslims. But then everybody knows the fate of Hudaibia agreements which proved only a convenient truce to bale them out of a difficult situation, for a total conquest of Mecca ultimately (p.14).

انڈیا آج ایک نئے عہد کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ آج اہل ملک کو، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو، ایک نیا تاریخی فیصلہ کرنا ہے۔ اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں کامیاب رہے تو دیش کامیاب ہوگا۔ اور اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں ناکام ہو گئے تو اس کے بعد دیش کے لیے تباہی اور بربادی کے سوا کوئی اور مستقبل نہیں۔

قیادت کا خلا

قومی پریس میں آج کل مسلسل ایسے مضامین اور ایسی رپورٹیں چھپ رہی ہیں جن میں ملک کے مستقبل کے بارہ میں سخت تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۲ اپریل ۱۹۹۳) میں مسٹر ایس ایس گل کا ایک آرٹیکل چھپا ہے، اس کا عنوان بمبئی کے بعد (Beyond Bombay) ہے۔ مضمون نگار نے ملک کی موجودہ ابتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

In modern times India has never before faced such a threat to its integrity and its very existence as a nation state. And we have never been so ill-equipped to face this challenge. The maladies are known, the remedies are known, but the physician is missing.

عہد حاضر میں انڈیا کو اپنے استحکام اور قومی ریاست کی حیثیت سے اپنے وجود کے لیے کبھی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور ہم اس چیلنج کا سامنے کرنے کے لیے کبھی اتنے بے مایہ نہ تھے۔ مصیبتیں معلوم ہیں، ان کا علاج بھی معلوم ہے، مگر ڈاکٹر موجود نہیں (صفحہ ۱۲)

یہ قیادت کے خلا کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اس خلا کو پُر کر سکتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہ وہ کسی شاعرانہ کلام کے حوالے سے اپنے کو محتسب کائنات ثابت کریں۔ یا یہ اعلان کریں کہ ہم خیر الامم ہیں، اس لیے ہمیں ساری دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیادت صبر کی قیمت پر ملتی ہے (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا) اس وقت جو صبر درکار ہے وہ یہ کہ مسلمان ماضی کی تلخیوں کو بھلائیں۔ برادرانِ وطن کی زیادتیوں پر مشتعل ہونا ترک کریں۔ وہ مانگنے کے بجائے دینے والے بنیں۔ وہ ملی وقار کو اشو بنانے کے بجائے انسانی خدمت کو اشو بنائیں۔ وہ تمام نزاعات کو یک طرفہ بنیاد پر ختم کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ وہ دوسری قوموں کے حریف بننے کے بجائے ان کے خیر خواہ بن جائیں۔ وہ اپنی تصویر یہ بنائیں کہ وہ حقوق کے لیے اٹھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے لوگ ہیں۔

یہی صبر قیادت کی لازمی شرط ہے۔ مسلمان اگر اس شرط کو پورا کر دیں تو قیادت ان کی طرف اس طرح دوڑ کر آئے گی جس طرح ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔

حج اسپرٹ

۱۹۸۲ میں میں نے حج کا فریضہ ادا کیا تھا۔ جن دنوں میں مکہ میں تھا، میری ملاقات کچھ عرب نوجوانوں سے ہوئی۔ ان نوجوانوں کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا جو کہ اسلامی انقلاب کی حامی ہے۔ اور مختلف مسلم ملکوں میں پرتشدد تحریک چلا رہی ہے۔ یہ نوجوان تعلیم یافتہ حاجیوں کے درمیان خفیہ طور پر کچھ عربی لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ مجھے بھی انھوں نے اپنا ایک سٹ دیا۔ میں نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں مسلح اسلامی انقلاب کی تبلیغ کی گئی تھی۔

اس قسم کے پروپگنڈے کا سلسلہ آج بھی مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔ غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہے۔ حرم کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا تو درکنار، جانوروں تک کو مارنا جائز نہیں۔ پھر ایسے محترم مقام پر کیوں ایسا لٹریچر پھیلایا جاتا ہے جو تشدد کے فلسفہ پر مبنی ہو، جس میں کچھ لوگوں کو دشمن اسلام کا لقب دے کر انھیں مارنے اور ہلاک کرنے پر ابھارا گیا ہو۔

قرآن میں مکہ کو بلد آمن (ابراہیم ۳۵) کہا گیا ہے، یعنی امن کا شہر۔ مکہ کی مقدس مسجد کو حرم آمن (العنکبوت ۶۷) اور بیت امن (البقرہ ۱۲۵) بتایا گیا ہے، یعنی امن کا گھر، امن وسلامتی کا مرکز۔ یہ امن وسلامتی حرم کی نہایت ابھری ہوئی حیثیت ہے۔ اس لیے حاجیوں کے اوپر سب سے زیادہ نمایاں اثر بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ مگر عملی صورت حال اس کے برعکس ہے۔

آج حاجیوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ساری دنیا سے ہر سال تقریباً تین ملین مسلمان حج کی ادائیگی کے لیے مکہ پہنچتے ہیں۔ مگر عین اس وقت سارے مسلم علاقوں میں پرتشدد تحریکیں جاری ہیں۔ حج کے اضافہ نے تشدد کے واقعات کو کم نہیں کیا۔ حاجیوں نے ابھی تک اپنے حج سے امن وسلامتی کا سبق نہیں لیا۔ حاجیوں کا قافلہ ہر سال اس لیے حرم مکہ جاتا ہے کہ وہ وہاں سے واپس آکر اس کی توسیع بنے، وہ ساری دنیا میں حرم کی خصوصیاتِ امن کو پھیلا دے۔ مگر فیوض حرم کی یہ توسیع ابھی تک ممکن نہ ہو سکی۔

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ لوگ حج کی حقیقت کو بھول گئے ہیں۔ آج کے لوگ حج کی صورت سے واقف ہیں۔ مگر وہ حج کی اسپرٹ سے واقف نہیں۔ حج کے مقام کو جب قرآن

میں امن وسلامتی کا مقام کہا گیا ہے تو اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حج کی اسپرٹ کیا ہے۔ حج کی اسپرٹ وہ اعلیٰ روحانیت ہے جو تمام بنی آدم کو ایک ہی انسانی روپ میں دیکھنے لگے۔

حج کی اسپرٹ امن ہے، جنگ نہیں۔ حج کی اسپرٹ محبت ہے، نفرت نہیں۔ حج کی اسپرٹ نرمی ہے، تشدد نہیں۔ حج کی اسپرٹ رحمت ہے، زحمت نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ حج کی یہی خصوصیت آج مسلمانوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حج کی یہ خصوصیت کہیں بھی موجودہ مسلمانوں کی قومی پالیسی کا جزو نہ بن سکی۔

لوگ حج کی ظاہری شکل کو دہرا کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حج کر لیا۔ حالانکہ حقیقی حج اس شخص کا ہے جو حج کو اس کی مثبت روح کے ساتھ ادا کرے۔ آج مکہ میں ہمیشہ سے زیادہ حاجیوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمان ساری دنیا میں اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر مسلمان سچی اسپرٹ کے ساتھ حج کر کے لوٹیں تو اچانک ساری دنیا میں امن کی فضا قائم ہو جائے۔ اس کے بعد مسلمان نہ صرف خود تشدد کرنا یا تشدد کی بات بولنا چھوڑ دیں، بلکہ وہ تمام لوگوں کے سامنے امن اور سلامتی کے مبلغ بن جائیں۔

آج ضرورت ہے کہ بیت حرم میں جانا مسلمان کے لیے بیت امن میں جانا بن جائے۔ وہاں جمع ہو کر تمام مسلمان توبہ و استغفار کریں۔ وہ ہر قسم کے تشدد کو چھوڑنے کا عہد کریں، خواہ وہ تشدد اسلام کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ حج کی عبادت سے وہ یہ عزم لے کر لوٹیں کہ وہ تشدد کے ہر طریقہ کو یک طرفہ فیصلہ کے تحت ختم کر دیں گے۔ وہ ساری دنیا کے لیے امتِ رحمت بن جائیں گے جس طرح ان کا نبی ساری دنیا کے لیے نبیِ رحمت بنا ہوا تھا۔

آج کی دنیا جنگ اور تشدد سے آخری حد تک اکتا چکی ہے۔ آج کی دنیا کو "مصلحانہ جنگ" سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی مفسدانہ جنگ سے۔ آج دنیا کو ایسے مذہب کی تلاش ہے جو اس کو تشدد کی آگ سے نکالے اور اس کو امن کی ٹھنڈک عطا کرے۔ حج ایسے ہی داعیان امن کی تربیت ہے۔ حقیقی حاجی وہ ہے جو امن کی تربیت سے فیض یاب ہو کر وہاں سے لوٹے۔ جس کے لیے حج تربیت گاہِ امن میں جانے کے ہم معنی بن جائے۔ یہی لوگ دوبارہ انسانیت کے اوپر رحمتِ خداوندی کا دروازہ کھولیں گے، وہ دروازہ جو صدیوں سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا ہے۔

غلطی کی تصحیح

میری ملاقات یوپی کے ایک ہندو نوجوان سے ہوئی۔ وہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں موجود تھے جب کہ وہاں بابری مسجد کو ڈھایا گیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر کی تعمیر کی گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا۔ انھوں نے کہا کہ بھارت کی پچھلی تاریخ میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، ان غلطیوں کو ہمیں درست کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے خیال کے مطابق، ۶ دسمبر کو ایک بڑی غلطی کی تصحیح کر دی۔ اب بتائیے کہ اس تصحیح سے دیش کا کتنا کلیان ہوا۔ لوگوں کے دکھوں میں کتنی کمی واقع ہوئی۔ خود آپ نے اپنی زندگی میں ترقی کی کتنی اور سیڑھیاں طے کیں۔ وہ میرے اس سوال کے جواب میں کوئی متعین بات نہ بتا سکے۔

پھر میں نے کہا کہ میرے بھائی، اگر آپ دیش کی غلطیوں کو درست کرنا چاہتے ہیں تو یہاں اور بھی زیادہ بڑی بڑی غلطیاں موجود ہیں، ان کو درست کیجئے۔ اجودھیا کی مسجد صحیح بنی تھی یا غلط، یہ تو ایک ایسا تاریخی مسئلہ ہے جو ابھی طے نہیں ہوا۔ مگر یہاں اور بہت سی بھیانک غلطیاں ہیں جن کا غلط ہونا مسلّم ہے، پھر آپ ان کو درست کرنے میں اپنی طاقت کیوں نہیں لگاتے۔ میں نے کہا کہ ہمارا دیش ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ مگر وہ دوبارہ اقتصادی غلامی میں جکڑ گیا۔ آپ دیش کو اقتصادی غلامی سے نکالئے اور اس کو سچی آزادی میں سانس لینے کا موقع دیجئے۔ ایک وقت تھا کہ بھارت ایک مہان دیش سمجھا جاتا تھا۔ آج عالمی نقشہ میں بھارت صرف ایک پچھڑا ہوا دیش بن گیا ہے۔ آپ دوبارہ بھارت کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلائیے۔

پہلے بھارت اپنی اعلیٰ روایات کے لیے مشہور تھا۔ آج وہ تمام روایتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ آپ ان اعلیٰ روایتوں کو دیش میں دوبارہ قائم کیجئے۔ پہلے دیش کے اندر قانون کا احترام پایا جاتا تھا۔ آج یہاں ہر طرف لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اس لاقانونیت کو ختم کر کے قانون کا دور واپس لائیے۔ پہلے ہمارا دیش اپنی خوش حالی کے لیے مشہور تھا۔ آج یہاں کی آبادی غریبی کا شکار ہو رہی ہے۔ آپ اس غریبی کو مٹا کر اس کو دوبارہ خوش حال بنائیے۔ درست کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ ان غلطیوں کو درست کریں نہ کہ فرضی غلطیوں کو جس سے دیش کا کچھ بھلا ہونے والا نہیں۔

۲۸ الرسالہ جون ۱۹۹۳

ایک سفر

پونہ میں مسیحی چرچ کے تحت ایک بہت بڑا ادارہ De Nobili College ہے۔ اس کے تحت ایک مذہبی مطالعہ کا ادارہ Institute for the Study of Religion قائم ہے۔ اس ادارہ نے ایک امریکی ادارہ کے تعاون سے پونہ میں ۲ - ۶ نومبر ۱۹۹۱ کو ایک کل مذاہب کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کی تھیم تھی: "ریلیجن اینڈ سوسائٹی" اس کانفرنس کی دعوت پر پونہ کا سفر ہوا اور اس کے بعد بمبئی وغیرہ کا سفر۔ ذیل میں اس کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲ نومبر کو گھر سے نکل کر ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تو انسانی تاریخ کا نقشہ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ موجودہ زمانہ میں سفر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ کر پختہ سڑکوں سے گزرتا ہوا اسٹیشن یا ایرپورٹ پہنچتا ہے۔ وہاں اس کے لئے ایک اور سواری موجود ہوتی ہے جو اس کو لیکر تیزی سے آگے روانہ ہوتی ہے اور اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ منزل پر دوبارہ یہی سارے انتظامات ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے آخری مطلوب مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

چند ہزار سال پہلے انسانی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔ انسان نیم حیوانات کی طرح جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ شہری زندگی کا وہ دور آگیا جس کو مدنیت (Urbanization) کہا جاتا ہے۔ مسلم عہد سے پہلے یہ رفتار بہت سست تھی۔ مسلم عہد میں انسانی تہذیب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بغداد کی جس طرح تعمیر کی وہ ماضی کے شہروں سے اتنا مختلف ہے کہ شہری تاریخ میں وہ ایک چھلانگ معلوم ہوتا ہے۔

اَربن پلاننگ کے پروفیسر ایگلی (Ernst Arnold Egli) نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں جنت کی زندگی اور جنت کے مکانات کا جس طرح بار بار ذکر کیا گیا ہے، اس نے مسلمانوں کے اندر عمدہ مکانات اور اعلیٰ تمدن کے بارہ میں ایک خیالی تصویر (dream image) بنائی۔ انھوں نے اس خیالی تصویر کو واقعہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجہ میں مسلم دنیا کے جدید شہر وجود میں آگئے (EB-18/1071)

مسلم تاریخ کے ان واقعات کو مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر قومی فخر کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کو مسلمانوں کے پر فخر کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کو آلاء اللہ کے طور پر بیان کیا جانا چاہئے۔

اس دنیا کی ہر ترقی اصلاً امکانات قدرت کو ظہور میں لانے کا نام ہے۔ انسان ان امکانات کو ایجاد کرنے والا نہیں، وہ صرف ان کو استعمال کرنے والا ہے۔ جب ایسا ہے تو ہم کو چاہئے کہ ان ترقیوں کو دیکھ کر ہم خدا کے گیت گائیں نہ کہ ان کو خود اپنے خانہ میں ڈال کر فخر اور ناز کرنے لگیں۔

گھر سے دہلی ایرپورٹ جاتے ہوئے راستہ میں ایک معاملہ پیش آیا۔ اس میں ایک بہت بڑا سبق تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا: لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا واحد آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی انا سے نہ ٹکرائیں۔ اگر آپ اس راز کو جان لیں تو آپ اپنے دشمنوں کے درمیان بھی دوست کی طرح رہ سکتے ہیں۔

دہلی ایرپورٹ پر ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective

ان سے دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل میں مسلمانوں کی فکری تاریخ پر ایک کتاب کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ اقبال کی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو پڑھا ہے۔ وہ ایک اچھی کتاب ہے۔ مگر میں اقبال کے بعض نظریات سے متفق نہیں۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ مثلاً اقبال کے مرد کامل (Perfect man) کے نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ وہ تاریخ کو ایک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ پرفکٹ انسان مستقبل میں پیدا ہوگا۔ یہ تصور اسلام کے عقیدۂ رسالت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ عقیدۂ رسالت کے مطابق، کامل اور پرفکٹ انسان پیغمبر کی صورت میں پیدا ہو چکا۔ اب مسئلہ پرفکٹ مین کی پیروی کرنے کا ہے نہ کہ پرفکٹ مین کا انتظار کرنے کا۔

ایرپورٹ کی کھڑکی پر اپنا بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے ایک واقعہ گزرا۔ اس کے بعد مجھے اسی قسم

کا ایک قصہ یاد آگیا جو میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔ ایک انگلش مین ایک بار کسی ایر لائن کے رزرویشن کاونٹر پر کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک موٹی عورت تیزی سے چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کے لئے تھا۔ مگر کلرک نے غلطی سے اس کو عام درجہ کا بورڈنگ پاس دے دیا تھا۔ عورت دوبارہ ہجوم کر کے کھڑکی پر پہنچی اور اپنا بورڈنگ پاس درست کرا کے فاتحانہ واپس ہوئی۔

عورت سے دھکا لگنے کی بنا پر لائن میں کھڑے ہوئے انگریز کا ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا ٹکٹ زمین سے اٹھایا اور سنجیدگی کے ساتھ خاتون سے کہا کہ میڈم، فرسٹ کلاس بورڈنگ پاس کا نام نہیں۔ فرسٹ کلاس ایک طریق زندگی ہے:

Madam, first class is not a boarding pass.
It is a way of life.

دہلی سے پونہ کے لئے انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۴۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے انگریزی اور ہندی میں مختلف چیزیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک صنعتی میگزین (Industrial Products Finder) تھا۔ یہ اس کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ تھا۔ ۲۳۲ صفحہ کے اس میگزین کے چار حصے تھے:

1. Industrial News Briefs
2. Commercial Info Exchange
3. Technical Articles
4. Product Index

یہ میگزین بزنس پریس (Business Press) کی طرف سے شائع ہوتا ہے جس کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہے۔ پورا میگزین صنعتی خبروں یا صنعتی سامانوں کے اشتہار سے بھرا ہوا تھا۔ عنوان نمبر ۲ کے تحت بہت سے لوگوں کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ ہم فلاں صنعتی شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ربط (contact) قائم کرنا چاہتے ہیں جو اس شعبہ میں ہم سے تعاون کریں یا فنی جانکاری (Technical know-how) دے سکیں۔

میں نے سوچا کہ مادی شعبوں میں لوگ دوسروں کا تعاون تلاش کر رہے ہیں۔ اور دینی شعبوں میں یہ حال ہے کہ دوسروں سے کٹ کر ہر آدمی اپنی الگ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ صنعت کار کا بنیادی مقصد کاروبار کو بڑھانا ہوتا ہے اور مذہبی رہنماؤں کا بنیادی مقصد شخصیت کو بڑھانا۔

چڑیوں کو بالائی فضا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر قدیم زمانہ سے انسان یہ خواہش کرتا رہا ہے کہ وہ فضا میں اڑے۔ قدیم اسپین میں ایک مسلمان عباس بن فرناس (م ۸۸۸ء) تھا۔ اس کے اندر نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کا شوق تھا۔ اس نے خاص طرز کی ایک بڑی سی چادر بنائی اور پھر چھتری کی مانند اس میں اپنے آپ کو باندھا اور بلندی پر چڑھ کر فضا میں چھلانگ لگائی۔ تھوڑی دور جاکر وہ زمین پر گر پڑا اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کا معاملہ قاضی سلیمان بن اسود الغافقی کی عدالت میں پیش کیا۔ قاضی نے اس کو غیر معتدل قرار دے کر حکم دیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے تجربات نہ کرے۔

احمد شریف الرفاعی کا مضمون (المدینۃ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹) نظر سے گزرا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ اگر عباس بن فرناس پر روک نہ لگائی جاتی تو یقیناً ہم ہوا بازی کے طریقہ کو ہزار سال پہلے جان لیتے۔ (لقد اعدموہ علیاً ... ولو ترکوہ لشأنہ لعرفنا الطیران قبل ألف سنۃ)

عرب مضمون نگار نے اپنا یہ مضمون "من شرفات التراث" کے عنوان کے تحت شائع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ جان سکے کہ ہوائی جہاز کا بننا طویل علمی تحقیق اور بے شمار تجربات کے بعد ممکن ہوا ہے۔ اس میں پوری انسانیت کا سفر شامل ہے۔ وقت کی حکومت اگر عباس بن فرناس کے لئے ساری سہولتوں کا ڈھیر لگا دیتی تب بھی یہ ناممکن تھا کہ جو ہوائی مشین بیسویں صدی میں بنی، وہ اچانک نویں صدی میں بن کر تیار ہو جاتی۔

میرے ساتھ بار بار ایسا پیش آیا ہے کہ میں ٹکٹ کے باوجود سفر نہ کر سکا۔ مثلاً ایک بار میرے پاس لمبے عالمی سفر کا ٹکٹ تھا۔ کسی وجہ سے مجھے اپنے سفر کو مختصر کرنا پڑا۔ میں نے ٹکٹ کی بچی ہوئی رقم کا واؤچر بنوالیا جو اس کے بعد کئی سفروں میں کام آیا۔

آخر میں میرے پاس دہلی۔ بمبئی کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس ٹکٹ کو دوبارہ رقم کی صورت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف سفر ہی میں اس کو استعمال کرنا ممکن تھا۔ مگر بار بار ایسے حالات پیش آئے کہ میں بمبئی کا سفر نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ٹکٹ کی مدت آخری طور پر ختم ہو گئی، اور وہ استعمال کے قابل

نہ رہا۔

تھوڑی دیر کے لئے احساس ہوا کہ ایک ٹکٹ بلاوجہ ضائع ہوگیا۔ مگر جلد ہی میرے اندر ایک نیا احساس جاگ اٹھا۔ میری زبان سے نکلا" خدایا، میں اس ٹکٹ کو دنیا کے سفر کے لئے استعمال نہ کر سکا۔ تو اپنی رحمت سے اس کو میرے لئے آخرت کا ٹکٹ بنا دے"۔ اس کے بعد نقصان کا احساس جاتا رہا اور دل میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوگیا۔

جہاز دہلی سے روانہ ہو کر منزل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ وہ رکے بغیر مسلسل اڑ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی بھی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹہ اور ۵۰ منٹ پر اناونسر نے اعلان کیا کہ اب ہم پونہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔

میں نے یہ الفاظ سنے تو مجھے محسوس ہوا جیسے اناؤنسر یہ کہہ رہا ہو کہ جہاز کے پرواز کی آخری حد آگئی۔ پھر میں نے سوچا کہ مختلف جہازوں کی مختلف حد ہوتی ہے۔ کوئی جہاز آدھ گھنٹہ اڑ کر اتر جاتا ہے کوئی ایک گھنٹہ اور کوئی دو گھنٹہ اور کوئی دس گھنٹے اڑنے کے بعد نیچے اترتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک شخص پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے۔ گویا اس کے جینے کی حد چند منٹ یا چند گھنٹے تھی۔ اسی طرح کوئی شخص چند سال گزار کر مرتا ہے۔ کوئی جوانی میں مرجاتا ہے۔ اور کوئی بوڑھا ہو کر مرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمر موت کی عمر ہے۔ آدمی کا ہر لمحہ اس کا آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت آدمی اپنی آخری حد پر کھڑا ہوا ہے۔ زندگی کا یہ معاملہ اتنا عجیب ہے کہ آدمی اگر اس کو سچے تو پر عیش محل میں بھی اس کی زندگی بے عیش ہو کر رہ جائے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہمارا جہاز پونہ ایر پورٹ پر اترا۔ کانفرنس کے نمائندے جو میری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ تو حسب قاعدہ ایر پورٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ مگر حلقہ الرسالہ کے لوگ ایر پورٹ کے اندر مجھ سے ملنے کے لئے موجود تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ اندر کیسے آگئے کیونکہ اندر آنا تو منع ہے۔ جناب عبد الصمد صاحب نے بتایا کہ گیٹ پر کھڑے ہوئے ایر پورٹ کے آدمی نے ان کو روکا۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہمارے" دھرم گرو" آرہے ہیں۔ یہ سن کر آدمی نے ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ مذہب میں آج بھی وہ طاقت ہے جو کسی دوسری چیز میں نہیں۔ بشرطیکہ مذہب کو ماننے والے اپنے آپ کو اشتعال انگیز کارروائی سے دور رکھیں۔

کانفرنس والوں نے بلیو ڈائمنڈ ہوٹل (پونہ) میں قیام کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ سب لوگوں کے ساتھ پہلے ہوٹل پہنچا۔ یہ ہوٹل شہر کے باہر ہے۔ چنانچہ ہوٹل پہنچنے کے بعد ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کرکے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرا قیام شہر میں ان لوگوں کے ساتھ ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ ملاقات کی صورت نکل سکے۔ میں نے کہا کہ کانفرنس کے منتظمین اگر اجازت دیدیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ منتظمین نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ہم سب لوگ ہوٹل سے شہر واپس آگئے۔

اس کے بعد میرا قیام پہلے مسٹر پی اے انعام دار کے مکان پر رہا۔ کانفرنس کے پروگرام کے مطابق، میٹنگوں میں شرکت کے لئے روزانہ ڈائمنڈ ہوٹل جاتا اور پھر دوبارہ انعام دار صاحب کے یہاں واپس آجاتا۔ آخر میں میرا قیام جناب عبد الصمد صاحب کے مکان پر تھا۔

پونہ اور بمبئی کے درمیان ایک تیز رفتار ٹرین چلتی ہے۔ اس کا نام "دکن کوئن" ہے۔ ٹرین کا نام پونہ کے نام پر ہے۔ مرہٹواڑہ کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر ہونے کی بنا پر پونہ کو دکن کوئن کہا جاتا تھا۔ اسی کے نام پر اس ٹرین کا مذکورہ نام رکھا گیا۔

سترھویں صدی میں مرہٹہ حکومت نے پونہ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ کچھ عرصہ کے لئے اس پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔ مگر ۱۷۱۴ سے دوبارہ مرہٹوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ۱۸۱۷ میں برٹش حکومت نے اس پر قبضہ کیا جو ۱۹۴۷ تک قائم رہا۔

برٹش دور میں پونہ میں تعلیم کا رواج کافی بڑھا۔ یہاں سب سے زیادہ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ چنانچہ جواہر لال نہرو نے ایک بار پونہ کو "انڈیا کا آکسفرڈ اور کیمبرج" کا نام دیا تھا۔ ۱۹۶۱ میں یہاں ایک ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا۔ پنشیت ڈیم کسی وجہ سے منہدم ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم پونہ کا ایک حصہ اس کی زد میں آکر بہہ گیا۔

دہلی سے پونہ ۱۶۰۰ کیلو میٹر دور ہے۔ قدیم زمانہ میں دہلی سے پونہ پہنچنے کے لئے ۱۶ دن سے بھی زیادہ وقت درکار تھا۔ مگر آج یہ سفر صرف دو گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ ۲ نومبر کو میں نے عصر کی نماز دہلی (نظام الدین) کی کالی مسجد میں ادا کی۔ مغرب کی نماز دوبارہ دہلی ایر پورٹ پر پڑھی۔ اور عشاء کی نماز کے وقت میں پونہ پہنچ چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو پیروں کے ساتھ پیدا کیا تاکہ وہ چل سکے۔ پھر اس کو گھوڑا دیا

جو گویا سواری کی زندہ مشین ہے۔ اس کے بعد انسان پر اسٹیم اور پٹرول کی طاقت منکشف کی جس کے نتیجہ میں ٹرین اور کار بنے۔ اور آخر میں ہوائی جہاز جیسی تیز رفتار سواری اس کو عطا کی۔

اس تدریجی طریق کار کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کے لئے کار اور ہوائی جہاز پر بیٹھنا ممکن نہ ہو سکا۔ پیغمبر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ مگر ان کے تمام تر تقدس کے باوجود خدا نے ان کے لئے اپنے قانون تدریج کو نہیں توڑا۔ اس سے خدا کی سنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تدریج اس دنیا کے لئے خدا کا اٹل قانون ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اور کسی کے لئے بدلا نہیں جاتا۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی۔ اگر دونوں جلوس ایک دن نکلتے تو یقینی تھا کہ پونہ میں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے اور جشن کا دن غم کے دن میں تبدیل ہو جائے۔ پونہ کی سیرت کمیٹی نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن مؤخر کر کے ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح دونوں جلوس پر امن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ اس واقعہ پر پولیس کے لوگ اور ہندو حضرات بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانشمندی کی تعریف کی۔ اس طرح دونوں جلوس پر امن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

سیرت کمیٹی پونہ نے اپنے فیصلہ کی اطلاع مراٹھی اخباروں میں شائع کرا دی تھی۔ اس سے پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ کئی مقامات پر مسلمانوں نے یہی کیا کہ اپنے جلوس کی تاریخ بدل دی۔ اس طرح پورا مہاراشٹر فساد کے خطرہ سے بچ گیا۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اب نیا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ ردعمل کی پالیسی ترک کر رہے ہیں اور اس کے بجائے اعراض کے طریقہ کو اپنی پالیسی کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔

پونہ میں ایک صاحب نے کہا کہ مجھے "شتم رسول" کے مسئلہ پر آپ سے سوال کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ فرمائیے۔ اس کے بعد جب وہ بولے تو انھوں نے ایک پوری تقریر کر ڈالی۔ انھوں نے اپنے مفروضہ مخالفین کے اوپر الزام تراشی بھی کی۔ ان کی پرجوش تقریر ختم ہوئی تو میں نے نرمی کے ساتھ کہا: یہ اسلام نہیں ہے کہ آدمی تحقیر رسول کے مسئلہ کو جانے مگر وہ تحقیر مسلم کے مسئلہ سے بے خبر ہو۔

تقسیم ملک (۱۹۴۷) سے پہلے ایک بار کسی سفر کے دوران میں پونہ ریلوے اسٹیشن سے گزرا

تھا۔ اس وقت میں نے چلتی ہوئی ٹرین سے پونہ شہر کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ریلوے لائن کے کنارے مجھے کچھ بنگلے دکھائی دئے جن کے اوپر پھول دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس مشاہدہ میں پونہ مجھے ایک افسانوی شہر نظر آیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ پونہ خوب صورت مکانات کا ایک شہر ہے جو چاروں طرف پھول اور سبزہ سے ڈھکا ہوا ہے۔

مگر ۱۹۷۱ میں جب پہلی بار میں نے پونہ کا سفر کیا اور شہر کے اندرونی حصوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پونہ بھی ویسا ہی ایک شہر ہے جیسا کہ ہندستان کے دوسرے شہر۔ دوسرے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی اگر خوبصورت مکانات ہیں تو اسی کے ساتھ تنگ اور بے کشش مکانات کی قطاریں بھی۔

یہی بات انسان کے بارہ میں بھی ہے۔ کسی انسان سے ابتدائی ملاقات میں وقتی طور پر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ اکثر حالات میں نہایت ناقص بلکہ خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ سنجیدگی اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقتی تجربہ کی بنا پر کبھی کلی رائے قائم نہ کی جائے۔ اسی قسم کی رائے کو شریعت میں ظن کہا گیا ہے۔ کسی شہر کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کر لی جائے تو اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ مگر انسان کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کرنا بے حد سنگین ہے۔ کیوں کہ اس میں اخلاقی پہلو شامل ہے اور وہ آدمی کو گناہ کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے (الحجرات ۱۲)

۲ نومبر کی شام کو انعام دار صاحب کے مکان پر دیر تک نشست ہوئی۔ جناب انیس چشتی صاحب اور دوسرے صاحبان آ گئے تھے۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ انیس چشتی صاحب تحریک پیام انسانیت سے وابستہ ہیں اور انھوں نے ملک کے مختلف گوشوں کا سفر کیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ملک میں کوئی شخص یا ادارہ ایسا ہے جو مخصوص طور پر غیر مسلموں میں دین پہنچانے کا کام کر رہا ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں۔

یہ بلاشبہ انتہائی سنگین صورت حال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان دوسری سرگرمیاں تو جاری ہیں مگر وہی اصل کام انجام نہیں دیا جا رہا ہے جو ہماری امت محمدی ہونے کی حیثیت کو متحقق کرتا ہے۔

انعام دار صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) نہایت ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے کئی قیمتی باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ چودہ سو سال پہلے قرآن میں اقرأ کا حکم آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔

چودہ سو سال پہلے ایک انسانی مصلح اگر عرب میں اٹھتا تو وہ صرف حال کے دائرہ میں سوچتا، جب کہ اقرأ ابدی دائرہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ حال کے اعتبار سے عرب میں یہ مسائل تھے کہ وہاں پانی نہیں۔ وہاں محفوظ راستے نہیں۔ ایک شخص جس کو صرف انسانی نظر حاصل ہو وہ اسی قسم کے قریبی مسائل میں الجھ جائے گا۔ مگر رسول نے علم کا پیغام دیا جو ابدی اہمیت کا حامل تھا۔ جو حال سے لے کر مستقبل تک انسان کے کام آنے والا تھا۔ اور جو اپنے وسیع انطباق کے اعتبار سے دوسرے تمام شعبوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کی مختلف نشستوں میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ شہر میں بھی کئی پروگرام ہوئے۔ ان سب کا تذکرہ یکجائی طور پر آئندہ کیا جائے گا۔

فیروز پونا والا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے سودی تجارت کے پرجوش مبلغ ہیں۔ انھوں نے پونہ میں بینک سے پندرہ لاکھ روپیہ سودی قرض لے کر ایک انڈسٹری لگائی۔ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انھوں نے سامان وغیرہ بیچ کر بینک کا قرض ادا کیا اور سود کے بغیر انڈسٹری چلانے کا فیصلہ کیا۔ آج وہ کامیابی کے ساتھ اپنی انڈسٹری چلا رہے ہیں۔

وہ بوہرہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بوہرہ فرقہ کے لوگ تجارت میں بہت کامیاب ہیں۔ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا ـــــ سادہ زندگی اور کم خرچ۔ ۴ نومبر کو مجھے انھوں نے اپنا کارخانہ دکھایا اور اپنے گھر بھی لے گئے۔ ان کی زندگی کو میں نے اس اصول کا معیاری نمونہ پایا۔ ان کا فلیٹ ۴۰ لاکھ روپیہ کا ہے۔ اور ان کی انڈسٹری ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی ہے۔ مگر ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہے۔

پونہ کے قریب پیر قمر علی درویش (م ۶۳۲ ھ) کی درگاہ ہے۔ یہ درگاہ ۱۹۵۱ سے باقاعدہ رجسٹرڈ طور پر قائم ہے۔ ساتھیوں کے کہنے پر اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔

یہاں "سوچنا بورڈ" پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے: نیاز اور دوسرے پروگرام مسلم طریقہ سے کرائیں۔ یہاں صحن میں کالے رنگ کا ایک گول پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس کا وزن تقریباً ساٹھ کیلو ہے۔ طاقت ور آدمی اس کو اکیلا اٹھا سکتا ہے۔

اس پتھر کے لئے یہاں روایت ہے کہ قمر علی درویش کا نام لے کر اٹھانے سے وہ اپنے آپ

اٹھ جاتا ہے۔ طریقہ کے مطابق، گیارہ آدمی پتھر کے چاروں طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی ایک انگلی پتھر سے لگاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک لمبا سانس کھینچ کر کہتا ہے "قمر علی درویش . . ." اس کے بعد پتھر اٹھ جاتا ہے۔ اور اس وقت تک اٹھا رہتا ہے جب تک سانس نہ ٹوٹے۔

میرے سامنے کئی بار لوگوں نے اس تدبیر پر عمل کر کے پتھر کو اٹھایا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک سادہ فطری واقعہ ہے نہ کہ کوئی پراسرار واقعہ۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کے اجلاس بلیو ڈائمنڈ ہوٹل میں ہوئے۔ ۳۰ نومبر کو کانفرنس کے شرکاء تین مختلف گروپ میں بانٹ دیئے گئے۔ میرے گروپ میں ایک درجن افراد تھے جو اسلام، ہندوازم اور مسیحیت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر ایک نے مذہب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے۔ ذریعہ اظہار یہاں صرف انگریزی تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عام طور پر اپنے آبائی مذہب کے بارہ میں بے یقینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مثلاً ہندو صاحبان نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے مذہب میں انسانیت کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ بات میرے ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ مسیحی حضرات نے اپنے بارہ میں بتایا کہ مسیح کی ابنیتِ خدا کا عقیدہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وغیرہ

میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اصلاً اسلامی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔ انگریزی میں نے بعد کو پرائیویٹ طور پر پڑھی۔ مگر جو اسلام مجھے خاندانی وراثت یا مدرسہ کے ماحول میں ملا تھا۔ اس سے میرے اندر بغاوت پیدا ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود اسلام کا اور دوسرے مذاہب کا باقاعدہ طور پر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اسلام کی صداقت از سر نو میرے اوپر منکشف ہوئی اور میں نے دوبارہ شعوری طور پر اسلام کو قبول کیا۔ اس طرح اسلام میرے لئے ایک ذاتی دریافت ہے نہ کہ محض قومی عقیدہ۔

میں نے کہا کہ اسلام کی فطری تعلیمات کے علاوہ اسلام کی جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ اسلام کا تاریخی پہلو تھا۔ دوسرے مذاہب کی کوئی معلوم اور مستند تاریخ نہیں۔ جب کہ اسلام مکمل طور پر اور مسلّمہ طور پر ایک تاریخی مذہب ہے۔ اسلام کو خصوصی اور امتیازی طور پر تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو

حاصل نہیں۔

۳ نومبر کی شام کی میٹنگ میں بعض لوگوں نے کہا کہ اسلام جہاد (قتال) کا مذہب ہے میں نے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ اسلام میں جنگ صرف بطور دفاع ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ پیغمبر اسلام نے پھر کیوں لڑائی لڑی۔ میں نے کہا کہ اس کا تعلق ایج فیکٹر سے ہے نہ کہ خود اسلام کی تعلیمات سے۔ قدیم زمانہ مذہبی جبر (religious persecution) کا زمانہ تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں ہر مذہب کو تشدد کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ اب آزادی کا زمانہ ہے۔ اس لئے اب عام حالات میں اس قسم کی صورت پیش آنے کا موقع بھی نہیں۔

کانفرنس تین دن کے لئے تھی۔ ہر روز پہلا پروگرام عبادت سے متعلق ہوتا تھا۔ پہلے دن ہندو عبادت، دوسرے دن اسلامی عبادت، تیسرے دن کرسچین عبادت۔ ۳ نومبر کی صبح کو عبادتی رقص (prayer dance) کا مظاہرہ تھا۔ چھ آدمیوں کی پارٹی اسٹیج پر آئی۔ اس کے پانچ ممبر ساز اور نغمہ میں مصروف ہو گئے۔ ایک ممبر نے اسٹیج پر رقص کی صورت میں اس کو مجسم کرنا شروع کیا۔

میں نے اپنے قریب کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہا کہ میں طبعی طور پر ان چیزوں سے انجوائے نہیں کر سکتا۔ مگر آج میں خاص طور پر واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس عبادتی پروگرام کو دیکھ رہا ہوں۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ طریقہ عبادت کو "اسٹیج کا شو" بنا دیتا ہے۔ ایک یا چند آدمی عبادت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بقیہ لوگ تماشائی کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔ میری سمجھ میں آیا کہ اسلام کے سوا ہر مذہب میں عبادت زیادہ تر "غیر" کا ایک فعل ہے۔ وہ "میرا" اپنا فعل نہیں۔ ان طریقوں میں ہر آدمی اپنے آپ کو عملِ عبادت میں شامل نہیں کر پاتا۔ وہ گویا اپنے لئے دوسرے سے عبادت کروا تا ہے۔ مزید یہ کہ جو شخص عبادت کو "اسٹیج" کرتا ہے اس کے لئے بھی عبادت زیادہ تر ایک آرٹ ہوتا ہے نہ کہ عبادت میں ذاتی شمولیت۔

اسلام میں چوں کہ عبادت اپنی اصل فطری حالت میں محفوظ ہے، اس لئے اسلام کا طریق عبادت ہی وہ واحد طریقہ ہے جس میں ہر آدمی ذاتی طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ اسلام میں ہر آدمی اپنی عبادت خود کرتا ہے۔

پونہ کی اس کانفرنس کو امریکہ کے ایک مسیحی ادارہ نے اسپانسر کیا تھا۔ وہ گاڈ کانفرنس

(God conference) کے نام سے دنیا کے مختلف ملکوں میں کانفرنسیں کر رہے ہیں۔ انڈیا میں یہ ان کی پہلی کانفرنس تھی۔ موجودہ زمانہ میں ہر مذہبی گروہ میں اس کی روایات کا احیاء ہو رہا ہے۔ دوسرے مذاہب میں بھی اور اسلام میں بھی۔ البتہ یہاں ایک فرق ہے۔ لوگوں سے گفتگو کے دوران میں نے پایا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عمومی احیاء مذہب کی اس لہر کو زمانہ سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اس کو اپنے اپنے اکابر کے کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

اسلامی عبادت کا پروگرام ۴ نومبر کی صبح کو جناب فیروز پوری والے نے کیا۔ اس میں انھوں نے صرف تلاوت قرآن کو لیا۔ پہلے قرآن کا ایک حصہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھا۔ اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ سنایا۔ مزید انھوں نے سورہ فاتحہ پڑھی اور اس کا انگریزی ترجمہ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اس کے بعد انھوں نے اسلامی عبادت کی تشریح کی۔ اور عبادت کی مختلف صورتوں کی تفصیل بیان کی۔ تمام حاضرین نہایت غور کے ساتھ اس کو سنتے اور دیکھتے رہے۔ بعد کو کانفرنس کے کئی شرکا نے قرآن کے مطالعہ سے دلچسپی ظاہر کی اور قرآن کا انگریزی ترجمہ طلب کیا۔

۵ نومبر کی صبح کو مسیحی عبادت (christian prayer) کا دن تھا۔ سب سے پہلے ایک بڑے شمع دان پر کئی موم بتیاں جلائی گئیں۔ اس کے بعد اسٹیج پر ایک مسیحی مرد اور دو مسیحی خاتون آئیں۔ انھوں نے باری باری انجیل (انگریزی) کے کچھ حصے پڑھے۔ اس کے بعد ملے ہوئے کمرہ سے ایک مرد اور ایک خاتون برآمد ہوئے۔ ان کے ساتھ ہارمونیم اور طبلہ تھا۔ انھوں نے ہندی اور بنگالی میں بھجن گائے اور ہارمونیم اور طبلہ بجایا۔

آج بھی مجھے دوبارہ وہی احساس ہوا جو ہندو عبادت کے دن ہوا تھا۔ مسیحی عبادت مجھے عبادت سے زیادہ ایک سماجی تقریب نظر آئی۔ ایک فرد کی فطرت اپنے آپ کو خدا کی پرستش میں شامل کرنا چاہتی ہے۔ مگر یہ مقصد ان عبادتی تقریبات کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتا۔

آج صبح کی میٹنگ میں مذہبی قدروں کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ میں نے کہا کہ اسلام میں اصل اہمیت "اسپرٹ" کی ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ اس میں انھیں باتوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے جن کا تعلق روح یا اسپرٹ سے ہے۔ ظاہری نوعیت کی احکامی آیتیں قرآن میں نسبتاً کم

ہیں۔ اس میں وہ آیتیں زیادہ ہیں جن کا تعلق اسپرٹ سے تعلق رکھنے والی باتوں سے ہے۔

۴ نومبر کی صبح کی میٹنگ میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کی آفاقی تعلیمات کو بیان کیا۔ میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اسلام کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ میں نے پایا کہ اسلام کی بنیاد دو بنیادی پرنسپل پر ہے۔ ایک خدا پر ایمان۔ دوسرے انسان کے لئے مفید بننا۔ پہلے پرنسپل کے لئے میں نے قل ھو اللہ احد کی تشریح کی۔ اور دوسرے پرنسپل کے لئے میں نے واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کی تشریح بیان کی۔

ایک اور مجلس میں میں نے کہا کہ اسلام کے تمام اصول کامن سنس پر مبنی ہیں۔ کامن سنس خدا کی تخلیق ہے۔ اسی طرح قرآن بھی خدا کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ چنانچہ دونوں میں کامل مطابقت ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے کامن سنس کو اس کی فطری حالت پر قائم رکھے تو وہ اسلام کو عین اپنے کامن سنس کے مطابق پائے گا۔

کانفرنس کے ساتھ ایک بک اسٹال لگا ہوا تھا۔ یہاں مختلف مذاہب سے متعلق انگریزی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ ایک کتاب حسب ذیل تھی:

God, The Self and Nothingness by Robert E. Carter

اس کتاب کے مختلف حصے دیکھے۔ دوسرے مذاہب پر کافی تفصیلی گفتگو تھی۔ مگر اسلام کے بارہ میں صرف چند مختصر حوالے تھے۔ مصنف نے ایک جگہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر کے حوالے سے حسب ذیل تاثر نقل کیا تھا:

For many years I have studied thoroughly the normative texts of Islam and Christianity. There appears to be no evidence in the texts for ... esoteric ecumenism (p.14).

برسوں تک میں بہت غور سے اسلام اور مسیحیت کی بنیادی کتابیں پڑھتا رہا ہوں۔ بظاہر ان کتابوں میں سری عالمگیریت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اس اسٹال پر انگریزی الرسالہ کا شمارہ بھی نظر آیا۔ ہم نے یہ الرسالہ انھیں فراہم نہیں کیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے الرسالہ کہاں سے حاصل کیا۔

کانفرنس کی ایک ڈیلی گیٹ ایک ۳۶ سالہ جرمن خاتون Mrs. Ursula McLackland تھیں۔ انھوں نے ایک میٹنگ میں اپنا تجربہ بتایا جو بہت سبق آموز تھا۔ ان کے الفاظ میں، وہ تجربہ یہ تھا:

The highest value in the eyes of the German youths is to become independant. Personally I don't agree. I was educated to look forward to lead an independant life away from my family as soon as I entered university. But, to my surprise, I was lonely and miserable, missing the interaction with my family. I,therefore, came back to my family. I also joined the German Unification Church to fill the gap in my life. However, I think I am rather an exception. Those of my generation are also not happy but they do not know why that is so. They have lost the conviction, becoming skeptics. One reason of the ever-increasing tourism industry lies in the restlessness found in our generation. It is this dissatisfication with their lives that they are attracted to travelling, in search of some happiness, fulfillment in life.

جرمن نوجوانوں کی نظر میں سب سے زیادہ قابل قدر چیز آزاد ہونا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ ابتداءً میری تعلیم اسی ڈھنگ پر ہوئی کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں اپنے خاندان سے باہر اپنے لئے ایک زندگی حاصل کروں۔ مگر جب میں نے ایسا کیا تو تعجب خیز طور پر میں نے پایا کہ میں تنہا ہوگئی ہوں اور مصیبت میں پڑگئی ہوں۔ میرے خاندان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

آخر کار میں اپنے خاندان کی طرف واپس آئی۔ مزید میں یونی فیکیشن چرچ سے وابستہ ہوگئی تاکہ میں اپنی زندگی کے خلا کو پر کرسکوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں جرمنی میں ایک استثنا ہوں۔ میری نسل کے اور جو لوگ ہیں وہ خوش نہیں ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے یقین کو کھو دیا ہے۔ وہ شک میں مبتلا ہیں۔

آجکل مغربی سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یہ لوگ اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہیں، اس لئے وہ اپنے مقامات سے نکل کر ادھر ادھر جارہے ہیں تاکہ وہ زندگی میں خوشی اور اطمینان کو تلاش کرسکیں۔ منشیات میں اضافہ کا سبب بھی یہی ہے۔

پونہ کانفرنس میں ڈاکٹر محمد اقبال جمیل سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ موجودہ زمانہ میں ایک تعلیمی طریقہ کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ اس میں پڑھنے سے زیادہ مشاہدہ پر زور ہے۔ چنانچہ اس کو تعلیم بذریعہ فطرت (Teaching through the study of nature) کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق بچوں کو کتابوں کے ذریعہ پڑھانے کے بجائے فطرت کے مظاہر کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً علم نباتات کو

براہ راست پودوں اور درختوں کے مطالعہ کے ذریعہ۔

عرب کے صحرا میں جب ہاجرہ اور اسماعیل کو بسایا گیا اور ان کے ذریعہ صحرا کے ماحول میں ایک نئی نسل بنائی گئی تو وہ گویا اس طریق تعلیم کا پہلا تجربہ تھا۔ کھلے میدان، پہاڑ، سورج، چاند، ستاروں کے ماحول میں بنو اسماعیل کو بسانا دراصل ان کو فطرت کی درس گاہ میں داخل کرنا تھا۔ اس درس گاہ فطرت میں تربیت پاکر جو اعلیٰ نسل تیار ہوئی اسی سے خیر امت کا وہ انسانی مجموعہ نکالا گیا جس کو صحابہ کرام کہا جاتا ہے۔

پونہ کے ایک مسلمان بزرگ نے بابری مسجد کے بارہ میں سوال کیا۔ میں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یہ ہماری نااہل لیڈرشپ ہے جس نے اپنی غلط پالیسیوں سے بابری مسجد کو ایک مسئلہ بنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ اب جب کہ معاملہ بگڑ چکا ہے، اب اس کا حل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اب تو صرف ایک حل ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان اس محاذ سے ہٹ جائیں اور ہندوؤں کے سنجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنا کام کرنے کا موقع دیں۔ ہندوؤں میں پچاس فیصد سے زیادہ لوگ اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ مگر جب ہم کسی مسئلہ کو ہندو قوم کے وقار کا مسئلہ بنا دیں تو اس طبقہ کے لئے اپنا عمل کرنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔

پونہ میں الرسالہ کے ایک قاری سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک مشہور عربی درس گاہ کے فارغ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے انگریزی اقتباسات میں بعض اوقات اردو ترجمہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے مجھے الجھن ہوتی تھی۔ میں شکایت کرتا تھا کہ دیکھو، انھوں نے انگریزی نقل کر دی مگر اس کا ترجمہ شامل نہیں کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں خود انگریزی پڑھ ڈالوں۔ اس سے مجھے دہرا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے انگریزی پڑھنا شروع کر دیا۔ خدا کے فضل سے اب میں نے اتنی انگریزی سیکھ لی ہے کہ انگریزی اقتباسات کو ترجمہ کی مدد کے بغیر سمجھ لیتا ہوں۔

یہ واقعہ مجھے بہت پسند آیا۔ اس مزاج کا تعلق صرف انگریزی سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی شکایت کرنے کے بجائے خود اپنی لیاقت کو بڑھائے۔ یہی تعمیری مزاج ہے۔ یہ مزاج اگر لوگوں کے اندر آجائے تو بہت سے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں۔

تقریباً دو ہفتہ کے اس سفر میں پونہ، بمبئی اور شولاپور جانے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ کافی تعداد میں

لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ رہائش گاہ پر صبح و شام لوگ جمع ہوتے رہے۔ اس طرح دوران سفر ہر روز غیر رسمی انداز میں لوگوں سے دعوتی، تربیتی اور تعمیری باتیں کہنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ہر جمعہ باقاعدہ اجتماعات کا پروگرام بھی جاری رہا۔

۴ نومبر کی شام کو پونہ میں جناب انعام دار صاحب کے مکان کی کھلی چھت پر ایک اجتماع ہوا۔ شہر کا تعلیم یافتہ طبقہ جمع ہوا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے ان مع العسر یسرا کی تشریح کی۔ میں نے کہا کہ زمین کے نیچے پٹرول کے خزانے ہیں۔ یہ قیمتی خزانے جہاں موجود ہوں وہاں زمین کے اوپر کچھ خاص علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان علامتوں کو دیکھ کر ماہرین سمجھ لیتے ہیں کہ یہاں پٹرول ہے۔ چنانچہ وہاں کھدائی کی جاتی ہے اور پٹرول کے زیر زمین چشموں کو حاصل کر کے ملک کو دولت سے مالا مال کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ آیت کے مطابق، عسر گویا یسر کی علامت ہے۔ جہاں عسر پایا جائے تو ہم کو پیشگی طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں اس کے قریب ہی ضرور یسر چھپا ہوا ہے۔ اور پھر یسر کو تلاش کر کے اس کا بھرپور استعمال کرنا چاہئے۔ یہی قرآن کے مطابق کامیاب عمل کا صحیح طریقہ ہے۔ یہ قرآنی اصول بیان کرنے کے بعد میں نے تفصیل سے بتایا کہ موجودہ عسر والے حالات میں کس طرح ہمارے لئے یسر موجود ہے۔

۵ نومبر کی شام کو جناب عبد الصمد صاحب کی رہائش گاہ کے سامنے کھلی زمین پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں ایک گھنٹہ کی تقریر میں میں نے بتایا کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے۔ اور اتحاد پیدا ہونے کا واحد راز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا مزاج پیدا ہو جائے۔ صحابہ کی مثال سے اس کو واضح کیا۔ اس تقریر کا ویڈیو کیسٹ بھی تیار کیا گیا۔

۶ نومبر کی صبح کو پونہ کی مکہ مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد پندرہ منٹ کے لئے تربیت کے انداز کی تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ حدیث میں ہے کہ من صلی الصبح فھو فی ذمۃ اللہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز پر اسرار طور پر آپ کی محافظ بن جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے نماز کے ذریعہ وہ اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو آدمی کے اندر تسخیری طاقت پیدا کرتے ہیں اور اس کو لوگوں کی طرف سے محفوظ کر دیتے ہیں۔

صلوا خلف کل بر و فاجر کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ برے لوگوں کو لاکر امام کی جگہ کھڑا کر دو۔ اس حدیث کا خطاب حقیقۃً امام کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ مقتدیوں کی طرف ہے۔ یعنی مسجد میں کسی کو امام بنا دیا گیا۔ اب ایک شخص کے اندر خیال پیدا ہوا کہ اس کے اندر تو فلاں خرابی ہے۔ تو جس شخص یا جن لوگوں کے دل میں اس طرح کا خیال آئے انھیں اپنے اس خیال کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہئے بلکہ اس کو نظر انداز کر کے امام کے پیچھے نماز پڑھتے رہنا چاہئے۔

۶ نومبر کی دوپہر میں لیڈی حوا ہائی اسکول پونہ کے ہال میں شہر کا پڑھا لکھا طبقہ جمع ہوا۔ ان لوگوں کے سامنے خطاب کا موقع ملا۔ موضوع تھا: تعلیم اور مسلمان۔ میں نے کہا کہ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو باشعور بناتا ہے۔ اور باشعور آدمی ہی اس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ باتوں کی گہرائی کو سمجھے اور مختلف مواقع پر صحیح فیصلہ لے سکے۔ قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ نیز تاریخ عالم کی مثالوں سے اس کو واضح کیا۔ اس تقریر کا بھی ویڈیو کیسٹ لیا گیا۔

۶ نومبر کی سہ پہر کو انعام دار صاحب کے مکان پر خواتین کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کی تعلیم یافتہ خواتین جمع ہوئیں۔ اس موقع پر میں نے عورت کے بارہ میں اسلام کا نقطہ نظر بیان کیا۔ میں نے کہا کہ عورت کا مقام عمل (workplace) گھر ہے نہ کہ باہر۔ اسلام میں عزت اور احترام کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں کا درجہ یکساں ہے۔ مگر مقام عمل کے اعتبار سے دونوں میں تقسیم ہے۔ عورت کا مقام عمل بنیادی طور پر اندر ہے اور مرد کا مقام عمل بنیادی طور پر باہر۔

پھر میں نے کہا کہ عورت کا اہم ترین کام اگلی نسل کی تیاری ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ اس کی دنیا کو آباد کرنے کے لئے مسلسل صالح انسان ملتے رہیں۔ یہ کام گھر کی تربیت گاہ میں انجام پاتا ہے۔ عورت یہ کام کرے تو اس کا درجہ مرد سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہاجرہ نے ایک نئی نسل بنائی تو حج اور عمرہ میں مردوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان کے نقش قدم کی پیروی کریں۔ مغرب میں لیڈیز فرسٹ کے صرف الفاظ ہیں اور اسلام میں سعی بین الصفا والمروۃ کی صورت میں عملاً یہ درجہ عورت کو دیدیا گیا ہے۔

۷ نومبر کو ٹنا ایکسپریس کے ذریعہ پونا سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ جناب فاروق فیصل صاحب ساتھ تھے۔ ان سے راستہ بھر دعوتی اور علمی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ اس طرح چار گھنٹہ کا یہ سفر بہت آسانی سے گزر گیا۔

ہماری ٹرین کلیان سے آگے بڑھی تو متوازی لائن پر ایک اور ٹرین آگئی۔ ہماری ٹرین کی طرح وہ

ٹرین بھی بمبئی کے رخ پر جارہی تھی۔ متوازی لائن پر اس ٹرین کے آنے کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے ہماری ٹرین پیچھے کی طرف جارہی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا محسوس ہوا کہ مقابل کی الکٹرک ٹرین آگے جارہی ہے اور ہماری ٹرین پیچھے کی طرف سفر کررہی ہے۔

یہ صرف نگاہ کا دھوکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ٹرینیں ایک ہی رخ پر بمبئی کی طرف دوڑ رہی تھیں مگر مقابل کی ٹرین کی رفتار چوں کہ تیز تھی اس لئے ظاہری تقابل میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ ٹرین آگے کی طرف جارہی ہے اور ہماری ٹرین پیچھے کی طرف۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری مشاہدہ اور حقیقی واقعہ میں بعض اوقات کتنا بڑا فرق واقع ہوجاتا ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ایک چیز مشرق کی طرف جارہی ہوتی ہے اور بظاہر دیکھنے والے کو ایسا نظر آتا ہے گویا کہ وہ چیز مغرب کی طرف چلی جارہی ہے۔ اس لئے آدمی کو محض ظاہری مشاہدہ کی بنیاد پر کبھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔

۷ نومبر کی شام کو ۸ بجے ہماری ٹرین بمبئی وی ٹی پہنچ گئی۔ یہاں سے ساتھیوں کے ہمراہ ڈاکٹر عبدالکریم نائک صاحب کے مکان (مجگاؤں) پہنچا۔ بمبئی میں میرا قیام انھیں کے یہاں رہا۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے حالات سن کر معلوم ہوا کہ ان کو ایک بڑا نقصان پیش آیا۔ جس کا ان کے اوپر اتنا اثر ہوا کہ ان کی صحت تباہ ہوگئی۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ قبول کریں تو میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ پھر ان کی اجازت سے میں نے ایک کاغذ لیا۔ اس پر یہ جملہ لکھ کر انھیں دیدیا ـــــ آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

روزانہ صبح اور شام کو مقامی احباب رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے سوال وجواب کی صورت میں گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں میں انتہائی پرامید ہوں۔ ان کے بارہ میں قرآن کی یہ آیت صادق ہوتی نظر آتی ہے: کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ (البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں خدا کا یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ فئۃ قلیلہ اکثر فئۃ کثیرہ پر غالب آتا ہے۔ ایک عرصہ تک مسلمان سیاسی جوش وخروش میں اپنی قوتیں ضائع کرتے رہے۔ اب حالات کا دباؤ مسلمانوں کو صحیح رخ دے رہا ہے۔ وہ سیاست کے محاذ سے ہٹ کر تعمیر کے میدان میں

خبرنامہ اسلامی مرکز ۸۹

۱ پیس مشن کے پروگرام کے تحت ۱۴ فروری ۔ ۲۰ فروری ۱۹۹۳ کو بمبئی اور پونہ کا سفر ہوا۔ اس دوران مختلف اعلیٰ شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور کئی اجتماعات میں خطاب ہوا۔ اس کی تفصیلی رپورٹ انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کی جائے گی۔

۲ اورنگ آباد کے اخبار رہبر (۱۴ فروری ۱۹۹۲) میں ایک رپورٹ کے تحت یہ خبر شائع ہوئی ہے : پروفیسر وگھن راجندر سانے کے بارہ میں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کی سیرت کو مرہٹی زبان میں ترجمہ کر کے مرہٹی داں عوام تک اسے پہنچانے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے سیرت کی متعدد کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کی نظر انتخاب مولانا وحید الدین خاں صاحب کی سیرت پر لکھی گئی پرافٹ آف ریولیوشن پر پڑی۔ مسٹر سانے نے اس کتاب کا مطالعہ کیا تو وہ حضورؐ کی زندگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس کتاب کا مکمل ترجمہ کر ڈالا۔ ایک ملاقات میں پروفیسر سانے نے کہا کہ اس کتاب کا اسلوب نہایت عمدہ، دل میں اتر جانے والا ہے۔

۳ سمواد پریاس کی طرف سے انڈین لا انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) میں ۲۱ فروری ۱۹۹۳ کو ایک ڈائیلاگ ہوا۔ اس کا موضوع اجودھیا کا مسئلہ تھا۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا۔

۴ انگریزی اخبار پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۲۴ فروری ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا، سوالات کا تعلق زیادہ تر اجودھیا اور اس کے بعد کے مسائل سے تھا۔

۵ امریکی براڈ کاسٹنگ کمپنی (Independent Broadcasting Associates. Inc.) کے نمائندہ مسٹر جولیان ہالک (Julian Crandall Hollick) یکم مارچ ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا، سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان کے مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ یہ انٹرویو ٹیپ پر ریکارڈ کیا گیا۔

۶ سنٹر فار پالیسی ریسرچ (نئی دہلی) کے تحت ۵ مارچ ۱۹۹۲ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ملک کے اعلیٰ دانشوروں نے شرکت کی۔ صدر اسلامی مرکز اس کی دعوت پر اس میں شریک ہوئے

اور وہاں اظہار خیال کیا۔ اس کا موضوع بحث تھا : ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد کیا ملک میں سیکولرزم کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔

۷ نئی دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ۵ مارچ ۱۹۹۳ کی شام کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع ملک کے موجودہ حالات پر روشنی ڈالنا تھا۔ دہلی کے تعلیم یافتہ ہندو بڑی تعداد میں شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور تقریباً آدھ گھنٹہ کی تقریر میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۸ پارلی منٹ ہاوس کے کمیٹی روم میں ۶ مارچ ۱۹۹۳ کو ایک ڈائیلاگ ہوا۔ اس کا اہتمام مسٹر جسونت سنگھ نے کیا تھا۔ اس کا موضوع تھا Our Republic - Post 6 December 1992 صدر اسلامی مرکز اس کی دعوت پر اس میں شریک ہوئے اور وہاں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

۹ انگلش ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے کی ٹیم ۶ مارچ ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئی۔ اس نے تفصیل کے ساتھ صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر کے بعد کے حالات پر تھا۔

۱۰ امریکی نیوز ایجنسی اے پی کے نمائندہ نے ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ اس کا خاص سوال یہ تھا کہ کیا ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد انڈیا کے مسلمانوں کی سوچ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ جواب دیا گیا کہ ہاں۔ وہ تبدیلی یہ ہے کہ پہلے مسلمان زیادہ تر جذباتی ردعمل کے تحت سوچتے تھے۔ اب وہ اس کے بجائے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچتے ہیں۔

۱۱ سرو سیوا سنگھ (سیوا گرام) کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ناگپور اور سیوا گرام کا سفر کیا۔ ۱۶-۱۷ مارچ ۱۹۹۳ کو سیوا گرام میں سرو سیوا سنگھ کے دو روزہ سیمنار میں شرکت کی۔ ۱۸ مارچ کو ناگپور میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ یہ تفصیلی رپورٹ انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۹ مارچ ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس کا عنوان تھا : رمضان اور جمعۃ الوداع۔

۱۱ ناگپور کے انگریزی روزنامہ لوک مت ٹائمس (Lokmat Times) کے نمائندہ نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مذکورہ اخبار کے شمارہ ۱۵ مارچ ۱۹۹۲ میں صفحہ اول پر شائع ہوا ہے۔

۱۴ امریکہ کی ایک خاتون پروفیسر پاولا نیوبرگ (Paula R. Newberg) ۲۰ مارچ ۱۹۹۲ کو اسلامی مرکز میں آئیں۔ وہ (Carnegie Endowment for International Peace.) کے تحت انڈیا اور پاکستان کے تعلقات پر ایک کتاب تیار کر رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے حالات پر صدر اسلامی مرکز سے تفصیلی انٹرویو لیا۔

۱۵ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ مارچ ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ اس تقریر کا موضوع تھا ——— روزہ اور عید میں انسانی قدریں۔

۱۶ بمبئی کے ماہنامہ البلاغ کے نمائندہ حضرات نے یکم اپریل ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کا تعلق ملی مسائل اور سہ نکاتی فارمولا سے تھا۔

۱۰ بمبئی میں ۲ اپریل ۱۹۹۲ کو ایک آل انڈیا کنونشن ہوا۔ اس کا انتظام ہندستانی اندولن کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں ان کی دو تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ بمبئی کی اہم شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔

۱۱ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کے تحت ۸ اپریل ۱۹۹۲ کو نئی دہلی میں اہل علم کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ٹرسٹ کی اس تجویز پر غور کیا گیا کہ "اسپر یچول ریڈر" کے نام سے ایک کتاب تیار کی جائے۔ اس کو ملک کی ہر زبان میں شائع کیا جائے اور اسکول کے تمام طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ لازمی ہو۔ صدر اسلامی مرکز منتظمین کی دعوت پر اس میٹنگ میں شریک ہوئے اور اس کے سلسلہ میں اپنی رائے پیش کی۔

۱۲ ہندی اخبار دینک جاگرن کے سینیر کرسپانڈنٹ اشوتوش چترویدی نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ملکی مسائل اور مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ تین نکاتی فارمولا کے بارہ میں بھی انھوں نے کئی سوالات کیے۔

۲ علماء اور دورِ حاضر نمبر انشاء اللہ جولائی ۱۹۹۳ میں شائع ہوگا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے تک) پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے ہاس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمت قرآن	30/-
عظمت اسلام	6/-
عظمت صحابہ	6/-
دین کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہور اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراط مستقیم	40/-
خاتون اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیث رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	95/-
ڈائری جلد دوم	95/-
سفرنامہ (نگی اسفار)	
سفرنامہ (غیر نگی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارف اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیات اسلام	-
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	6/-
صداقت اسلام	-
علماء اور دور جدید	-
ہندستانی مسلمان	6/-
سیرت رسولؐ	
اسلام ایک عظیم جدوجہد	3/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
اسلام کا تعارف	2/-
ہندی	
سچائی کی تلاش	6/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
پیغمبر اسلام	3/-
منزل کی اور	3/-
عربی	
الاسلام یتحدی	85/-
الاسلام والعصر الحدیث	55/-
آڈیو کیسٹ	
A-1 حقیقت ایمان	25/-
A-2 حقیقت نماز	25/-
A-3 حقیقت روزہ	25/-
A-4 حقیقت زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقت حج	25/-
A-6 سنت رسولؐ	25/-
A-7 میدان عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحاد ملت	25/-
A-12 تعمیر ملت	25/-
A-13 نصیحت لقمان	25/-

تذکیر القرآن کیسٹ (تلاوت، ترجمہ وتفسیر)	
A-14 متفرق سورتیں ۱	30/-
A-15 متفرق سورتیں ۲	30/-
A-16 متفرق سورتیں ۳	30/-
ویڈیو کیسٹ	
V-1 پیغمبر انقلاب	200/-
V-2 اسلام داعی امن	200/-
V-3 اسلام دور جدید کا خالق	200/-
V-4 امت مسلمہ اور جدید چیلنج	200/-
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	200
V-6 اسلام اور دور حاضر	200/-

God Arises	75/-
Muhammad	75/-
The Prophet of Revolution	
Islam As It Is	40/-
God Oriented Life	60/-
Words of the Prophet	-
Introducing Islam	-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	-
Islam the Creator of Modern Age	-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	-
Words of Wisdom	-

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1982	60/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)
1991 تا 1984 فی جلد 80/-

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)
1990-91 85/-

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

THE ISLAMIC CENTRE C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013